کہانی بول پڑتی ہے

پوپ کہانیاں



ڈاکٹر رضیہ اسماعیل



کہانی بول پڑتی ہے

پوپ کہانیاں

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

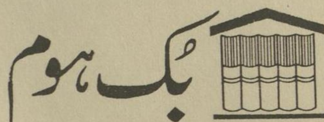


BOOK HOME

کہانی بول پڑتی ہے

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

اہتمام	رانا عبدالرحمٰن
پروڈکشن	ایم سرور
کمپوزنگ	محمد انور
پرنٹرز	حاجی حنیف پرنٹرز، لاہور
اشاعت	2012ء
سرورق	بشکریہ ڈین سیلرز (Dan Sellers) (Abundance Through Evolution)
قیمت	300 روپے - 7 پاؤنڈ - 12 ڈالر
ناشر	بک ہوم لاہور



بک سٹریٹ 46- مزنگ روڈ لاہور، پاکستان
فون: 37245072-37231518-042 فیکس: 37310854-042
bookhome1@hotmail.com - bookhome_1@yahoo.com
www.bookhomepublishers.com

انتساب

شریکِ سفر

اسماعیل اعظم

کے نام

جنہوں نے میری کہانیاں نہایت دلچسپی سے سن کر فکر انگیز
مشوروں سے نوازا اور اس کام میں میری معاونت کرتے ہوئے
دو پوپ کہانیوں کے اردو تراجم بھی کیے!

حسنِ ترتیب

پوپ میوزک سے پوپ کہانی تک

داستان گوئی یا قصہ کہانی کہنے، سننے اور سنانے کا فن اتنا ہی قدیم ہے جتنی کہ خود انسانی تہذیب بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ انسان کے اس کرۂ ارض پر قدم رنجہ فرمانے سے بہت پہلے ہی کہانی وجود میں آ چکی تھی تو اس میں شاید کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہو گی۔ ابتدائے آفرینش سے وجود میں آنے والی کہانی کا تانا بانا خود حضرتِ انسان ہی کے گرد گھومتا ہے۔ نیکی اور بدی کی قوتوں میں موجود ازلی کشمکش نے ایک ایسی کہانی کو جنم دیا جو انسان کے اس کرۂ ارض پر آباد ہونے کی وجہ ٹھہری۔

باالفاظ دیگر کہانی زندگی سے الگ نہیں ہے اور نہ ہی زندگی کہانی سے الگ کوئی چیز ہے بلکہ دونوں ایک دوسرے کو کمپلیمنٹ کرتی ہیں۔ اسی بات کو کسی صاحبِ بصیرت نے یوں بیان کیا ہے کہ ''کہانی کے پردے میں زندگی دھڑکتی ہے۔'' گویا کہانی صرف وقت گزاری کے لیے، دلچسپی یا چٹخارے کی چیز نہیں ہے بلکہ زندگی کی سچی اور اصلی تصویر پیش کر کے اس کی بہت سی ایسی حقیقتوں سے پردہ اٹھاتی ہے جنہیں عام انسان کی نظر دیکھنے سے محروم رہتی ہے۔

ویسے تو اردو نثری ادب، ناول، ناولٹ، افسانہ، افسانچہ کہانی بلکہ مختصر کہانی (یک سطری دو یا سہ سطری) سے مالا مال ہے مگر کچھ عرصے سے ''پوپ کہانی'' کی

بازگشت ادب کے ایوانوں میں سنائی دے رہی ہے اور ایک بحث سی چل نکلی ہے کہ آخر ''پوپ کہانی'' عام روایتی کہانی سے کس طرح الگ ہے کہ اسے ''پوپ کہانی'' کا نام دے کر اسے ایک نئی صنف تسلیم کر لیا جائے۔ آخر اس کی اپنی ہیئت، تکنیک اور پہچان کیا ہونی چاہیے کہ اسے دوسری نثری اصناف کے ہجوم میں الگ سے پہچانا جا سکے۔ جیسا کہ اردو شاعری میں غزل، نظم، آزاد نظم، نثری نظم، رباعی، ماہیا، دوہا، ہائیکو وغیرہ اپنی اپنی ہیئت اور تکنیک کی بنا پر ایک نظر میں ہی پہچان لی جاتی ہیں۔ تو اسی طرح ''پوپ کہانی'' کی پہچان کیا ہے؟ یعنی کونسی چیز ایک کہانی کو ''پوپ کہانی'' کا درجہ دیتی ہے۔ اگر اس کہانی میں کوئی انفرادیت ہے تو پھر اس کا اپنا کوئی فارمیٹ ہے یا نہیں؟ یا پھر صرف کسی بھی کہانی کے ساتھ ''پوپ کہانی'' کے الفاظ لکھ دینے سے کیا اس کے ایک الگ یا نئی صنف ہونے کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے؟ ایسے بہت سے سوال ہنوز جواب طلب ہیں!

مقصود الٰہی شیخ جو کہ ایک منجھے ہوئے قلمکار ہیں ان کی ''پوپ کہانیوں'' کی کتاب 2011ء کے اوائل میں منصۂ شہود پر آئی تو کسی نے اسے ''پوپیاں'' (مصنف نے خود بھی انہیں پوپیاں کہا ہے) تو کسی نے اسے ''پاپ کہانی'' کا نام دے ڈالا تو کسی نے اسے اردو ادب میں ایک نئی صنف کا درجہ دے کر اس کی دریافت کا سہرا شیخ صاحب کے سر باندھا!!!

کئی رسائل و جرائد میں ''پوپ کہانی'' پر کئی تبصرے نظر سے گزرے تو میرا ذوقِ تحقیق و جستجو بھی انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا مگر ''پوپ کہانی'' کے بارے میں کوئی بھی رائے قائم کرنے سے پہلے میرے لیے ضروری تھا کہ میں اصل کتاب کا مطالعہ

کروں۔ اولین فرصت میں شیخ صاحب سے (بریڈفورڈ) رابطہ کرکے ہدیے کا چیک سپرد ڈاک کیا تو چند ہی دنوں میں پوپ کہانیوں کی کتاب، مخزن کا آ رن (تاریخی) شمارہ اور چند اردو اخباروں کے تراشے بذریعہ ڈاک موصول ہوئے۔ ایک ہی نشست میں اپنے فکری تجسس کی تسکین کر ڈالی۔

کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے پیش لفظ علی سفیان آفاقی کا لکھا ہوا ہے جبکہ ''نئی صنف'' کے عنوان سے شیخ صاحب نے مختصر سا مضمون پوپ کہانی کی وضاحت میں قلمبند کیا ہے اور ان کی اکیس پوپ کہانیاں اس حصے میں شامل ہیں۔ اس حصے میں ممتاز حسین کا مضمون ''پوپیار تنگ نہ کر'' جبکہ دوسرے حصے میں عمران نقوی (انٹرویوز) صفیہ صدیقی، جاوید اختر پاشا، احمد صفی، ڈاکٹر عمران مشتاق، ڈاکٹر مجیبر احمد آزاد کے تبصرے اور کہانیوں کے علاوہ سیّد ظفر ہاشمی (ایڈیٹر گلین) اور تنویر اختر (ایڈیٹر ماہنامہ ساحل) کے تبصرے شامل ہیں۔ ہر ایک قلمکار اور تبصرہ نگار نے ''پوپ کہانی'' کو اپنے اپنے انداز میں دیکھنے، سمجھنے اور لکھنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً علی سفیان آفاقی رقمطراز ہیں کہ ''شیخ صاحب نے اردو ادب میں ایک نئی صنف متعارف کی ہے۔'' آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ''انہوں نے مشرق و مغرب کے امتزاج سے کہانی کی ایک نئی صنف ایجاد کی ہے۔''

''پوپ کہانی'' کی وضاحت کرتے ہوئے شیخ صاحب نے لکھا ہے کہ ''پوپ کہانی افسانہ، افسانچہ یا پارۂ لطیف سے جدا ہے۔ کچھ ہے تو اپنے گوناں گوں موضوعات اچانک آمد پر قلم بند کرنے کا نام ہے۔ جب قلم سے جڑا احساس دل کسی واردات کو تحریک و فیضان ملنے یا انسپائر ہونے پر سینے میں بند رکھنے کی بجائے عام فہم

لفظوں میں سپردِ قرطاس کر دے تو لفظوں کا یہی روپ پوپ کہانی ہے۔ یہی اس کا نیا پن یا اس میں ''نیا'' ہے یا پھر پوپ کہانی سے نازک سہل اور فوری تاثر پیدا ہوتا ہے۔ ''صفیہ صدیقی نے اسے دل سے نکلی ہوئی آہ یا خوشی سے لگایا ہوا قہقہہ قرار دیا ہے'' مگر سید ظفر ہاشمی تو اسے کوئی نئی صنف ماننے کو تیار ہی نہیں اور لکھتے ہیں کہ ''میں نے ان کہانیوں میں کوئی بات ایسی نہیں پائی کہ جو فی الوقت اِدھر اُدھر دکھائی دینے والے افسانچوں، منی کہانیوں، یک سطری، دوسطری چٹکلوں سے مختلف ہو اور جن کی بنا پر انہیں ایک الگ صنف قرار دیا جائے بجز اس کے کہ ان پوپ کہانیوں کا ماحول اور افکار مغربی ہیں اور کردار قید و بند سے آزاد، بے لگام معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں۔'' مزید لکھتے ہیں کہ ''فاضل مضمون نگار نے اپنے مضمون میں پوپ کہانیوں کی نہ تو کوئی تعریف بیان کی ہے اور نہ ہی اس پر بحث کی ہے کہ ان کی ہیئت اور تکنیک کیا ہے اور کن معنوں میں یہ منی کہانیوں/ افسانچوں سے مختلف ہیں۔''

ماہنامہ ساحل کے مدیر تنویر اختر کی رائے میں ''Pop انگریزی لفظ Popular کا مخفف ہے اور اس موسیقی کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو عام طور پر کاروباری بنیادوں پر ریکارڈ کی گئی ہے۔

مزید لکھتے ہیں کہ ''ان کہانیوں کے لکھنے کے انداز میں واضح فرق موجود ہے۔ یہ نظم کے مصرعوں کی صورت، مکالمے، خود کلامی یا روایتی کہانی کے نثری انداز میں لکھی گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ موضوع اور انداز کے لحاظ سے اس کی سمت ابھی طے ہونا باقی ہے مگر ایک بات مشترک ہے کہ یہ سب مختصر ہیں جیسے آپ لنچ کی بجائے سینڈوچ کھا لیں۔''

مئی 2011ء کے ندائے ملت میں انور سدید نے اپنے تبصرے میں لکھا ہے کہ ''مجھے خدشہ ہے کہ پوپ کہانی کی اصطلاح تاحال اپنے خدوخال سے محروم ہے اور شیخ صاحب نے جس قسم کی پوپ کہانیاں لکھی ہیں ان سے اولیت کا دعویٰ تو کر سکتے ہیں اور موجد بھی کہلا سکتے ہیں لیکن اس سے کہانی نئی جہت کی طرف بڑھتی نظر نہیں آتی اور۔۔۔اس میں روایتی کہانی کا پورا اسٹرکچر موجود ہے۔''

علی سفیان آفاقی کا یہ کہنا کہ شیخ صاحب نے پوپ کہانی کی اصطلاح پوپ میوزک سے وضع کی ہے۔اور مشرق و مغرب کے امتزاج سے کہانی کی ایک نئی صنف ایجاد کی ہے۔میرے لیے سوچ کے بہت سے دریچے کھول گیا کہ اگر پوپ کہانی کی اصطلاح پوپ میوزک سے وضع کی گئی ہے تو پھر پوپ کہانی کا موسیقی سے کوئی نہ کوئی رشتہ ضرور رہا ہوگا اور اگر نہیں بھی رہا تو کیا اردو ادب میں لکھی جانے والی ''پوپ کہانی'' کو مشرقی کلاسیکی موسیقی سے منسلک کر کے پوپ کہانی کے خدوخال کو پروان چڑھایا جا سکتا ہے۔اس طرح کے بہت سے سوال تھے جنہوں نے مجھے مشرقی کلاسیکی موسیقی کے مطالعے کی طرف راغب کیا۔

جس زمانے میں امریکہ میں پوپ میوزک کا آغاز ہوا تو پیش نظر یہ سوچ تھی (موسیقی جو اس وقت تک صرف خواص یعنی ایلیٹس (Elites) کے لیے مخصوص تھی۔ عام آدمی کے لیے اسے سننا سمجھنا اور ذہنی اور مالی طور پر اس سے حظ اٹھانا اتنا آسان نہیں تھا) کہ ایک ایسی موسیقی کی داغ بیل ڈالی جائے جو کہ عام فہم ہو اور ایک عام شخص کی دسترس میں ہو۔یعنی کہ خواص کے لیے نہیں بلکہ عوام میں مقبول ہو اور یوں اسے پوپ میوزک کا نام دیا گیا۔یہ میوزک نوجوان نسل میں انتہائی مقبول ہو کر بہت مختصر

عرصے میں مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑتی ہوئی ساری دنیا میں پھیل گئی۔

اس ایک نقطہ نے میری توجہ انگریزی اور امریکن لٹریچر دونوں کی طرف مبذول کروائی مگر میں پہلے اپنی مشرقی کلاسیکی موسیقی کی تلاش و جستجو کو بیان کرنا چاہوں گی۔ مجھے برطانیہ میں مشرقی کلاسیکی موسیقی پر کوئی قابل ذکر کتاب نہیں مل پائی تو میں نے پاکستان میں اپنے قلمکار دوستوں زاہد مسعود اور شہناز مزمل سے رابطہ کر کے متعلقہ کتابیں بھجوانے کی استدعا کی۔ شہناز مزمل نے سید محمد اسلام شاہ کی ''غزل گائیکی'' اور ''طائرانہ نظر'' کے نام سے دو کتابیں پہلی فرصت میں مجھے برطانیہ بھجوائیں۔ زاہد مسعود نے تلاش بسیار کے بعد ''معارف النغمات، حصہ اول'' از محمد نواب علی خان جو کہ استاد بدرالزماں (صدارتی تمغہ حسن کارکردگی) کی ترتیب و پیشکش تھا، بھجوائی جو کہ اس سلسلے میں بے حد مفید ثابت ہوئی۔ جس کے لیے میں ان کی بے حد شکر گزار ہوں۔

مشرقی موسیقی کا مطالعہ کرتے ہوئے میرے پیش نظر یہی نکتہ تھا کہ اگر پوپ کہانی لکھتے وقت اسے کسی نہ کسی راگ یا راگنی کے تابع کر دیا جائے یا اس سے منسلک کر دیا جائے تو شاید ہمیں پوپ کہانی کی ہیئت، تکنیک یا فارمیٹ کو مشرق میں ڈویلپ کرنے میں، اس کی الگ پہچان بنانے میں کوئی کامیابی ہو سکے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ انسانوں کی ذہنی اور جذباتی کیفیات کی مانند راگ اور راگنیاں بھی مختلف اوقات میں مخصوص ذہنی اور جذباتی کیفیات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مثلاً راگ ملہار، برسات کے موسم کی کیفیت کو باندھتا ہے تو راگ بھیروی، بلاول، بھیم پلاسی اور بھوپال بہت شانت، سنجیدہ اور سکون آور راگ ہیں۔ راگ پیلو اداسی کی کیفیت کا مظہر ہے تو تلک

کمود اور ونداون شوخ و چنچل راگ ہیں جبکہ بھاگیہ شری ایک گمبھیر راگ ہے۔ اسی طرح مالکوس، ایمن اور پنچم وغیرہ مختلف جذباتی کیفیات کے مظہر ہیں۔

کلاسیکی موسیقی کے مزید مطالعے سے پتہ چلا کہ موسیقی میں کل 9 ٹھاٹھ ہیں اور ہر ایک ٹھاٹھ کے اندر بہت سے راگ ہیں۔ مثلاً کلیان ٹھاٹھ (17 راگ)، بلاول ٹھاٹھ (24 راگ)، کھماچ ٹھاٹھ (18 راگ)، بھیروں ٹھاٹھ (20 راگ)، بھیرویں ٹھاٹھ (23 راگ) ٹوڑی ٹھاٹھ (6 راگ) پوربی ٹھاٹھ (14 راگ)، ماروا ٹھاٹھ (13 راگ) کافی ٹھاٹھ (32 راگ) پر مشتمل ہے۔ اس پر راگوں سے نکلتی ہوئی بے شمار راگنیاں اور راگوں کے لچھمن مثلاً گرہ، انش نیاس، تار، مندر، اپنایاس، سنیاس، ونیاس بہت اور الپت اور اس پر تال آستائیاں، انترے، سرتیاں اور ماترے وغیرہ وغیرہ پڑھتے پڑھتے مجھے محسوس ہوا کہ موسیقی تو ایک ایسا بحرِ زخار ہے جس میں ایک پوپ کہانی لکھنے والا ڈوب تو سکتا ہے مگر شاید پاپ کہانی نہیں لکھ پائے گا۔ سچ کہوں کہ موسیقی کے اس بحرِ بیکراں کے سامنے مجھے ننھی منی پوپ کہانی ایک ''لولی پوپ'' سے زیادہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس لیے میں نے یہ بھاری پتھر چوم کر چھوڑ دیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ پوپ کہانی اور مشرقی کلاسیکی موسیقی کے تال میل پہ مزید کام نہیں ہو سکتا۔

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے!

اب آتی ہوں انگریزی اور امریکن لٹریچر کی تلاش و جستجو کی طرف۔ جیسے جیسے میری تحقیق آگے بڑھتی گئی تو میں یہ جان کر نہایت خوشگوار حیرت سے دوچار ہوئی کہ امریکن لٹریچر میں پوپ کہانی ایک نہایت پختہ نثری صنف کے طور پر پہلے سے ہی موجود ہے اور

بہت عرصے سے لکھی اور پڑھی جارہی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ پوپ میوزک سے پہلے ہی امریکن لٹریچر میں ''پوپ اسٹوری'' بے حد مقبول ہو چکی تھی تو کچھ غلط نہ ہوگا بلکہ امریکہ میں ایک وقت ایسا تھا کہ پوپ میوزک کی بجائے پوپ اسٹوری زیادہ مقبول تھی اور اس کے رائٹرز راک اسٹارز کی طرح سیلبرٹی کا درجہ رکھتے تھے۔ جن میں ارنسٹ ہمنگوے (Ernest Hemengway) ایڈگر ایلن پو (Edgar Alan Poe) ایف سکاٹ فٹز جیرالڈ (F. Scott Fitgerald) ڈیومس (Dumas) ار آیل سٹیونسن (R.L Stevenson) جیک لندن (Jack London) او ہنری (O,Henry) اور جارج سمنن (George Simenon) نے ناولوں کے ساتھ ساتھ بہت اچھی پوپ کہانیاں لکھ کر بے حد داد وصول کی۔ دی موسٹ ڈینجرس گیم (The most Dangerous game) اور لیڈی اور دی ٹائیگر (The Lady or The Tiger) اعلیٰ درجے کی خالصتاً پوپ کہانیاں ہیں جو اپنے وقت میں بے حد مقبول ہوئیں۔

امریکن لٹریچر میں اس سوال کا جواب نہایت سلیقے سے دیا گیا ہے کہ آخر مختصر کہانی اور شارٹ اسٹوری کے مقابلے میں پوپ اسٹوری لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ آخر وہ کونسے عوامل تھے جنہوں نے ایک روایتی کہانی کو پوپ میں تبدیل کردیا!!

پوپ کہانی کیوں؟ (Why Pop Story)

لکھا ہے کہ ''مغربی ادب میں رفتہ رفتہ شارٹ اسٹوری کو بہت پیچھے دھکیل دیا گیا اور دیگر تمام اصناف کے مقابلے میں شارٹ اسٹوری سب سے زیادہ متاثر ہوئی۔ مثلاً

ایک وقت تھا کہ شارٹ اسٹوریز شائع کرنے والے مختلف رسائل و جرائد بہت بڑی تعداد میں شائع ہوتے تھے پھر یہ رسائل بند ہونے لگے اس لیے کہ شارٹ اسٹوری کے قاری خطرناک حد تک کم ہوتے جا رہے تھے۔ مغرب کی تیز رفتار زندگی میں کہانی کہیں بہت پیچھے رہ گئی تھی اور زندگی قاری کو لے کر بہت آگے نکل گئی تھی۔"

مغرب میں آج بھی بہت اچھی شارٹ اسٹوریز لکھی جا رہی ہیں اور یہاں اس صنف کے بہت اچھے قلمکار موجود ہیں مگر زیادہ تر شارٹ اسٹوری کی کتب سٹوروں میں شیلفوں پر گاہکوں کے انتظار میں پڑی رہتی ہیں جس طرح ایک جوان طوائف کے مقابلے میں ایک ادھیڑ عمر طوائف کو گاہک کے لیے زیادہ انتظار کرنا پڑتا ہے۔ قاری ان کو خرید نہیں رہا اور وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ Short stories are not connecting with the American public اس کے مقابلے میں ٹی وی، کمپیوٹر، میوزک، اسپورٹ، آئی پوڈ، فیس بک، ٹوٹر اور ای بکس (E-books) نے تیزی سے اپنی جگہ بنالی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ہر کوئی موٹر وے کی فاسٹ لین میں جا رہا ہے اور عام کہانی بہت سست رفتاری سے تھرڈ لین میں چل رہی ہے۔ ان حالات میں پوپ کہانی نے امریکن ادب میں اپنی جگہ بنالی ہے۔

اس بات کی گواہی میں اپنی ایک انگریزی قلمکار دوست (Gaynor Arnold) کے ساتھ ہونے والی گفتگو سے بھی دے سکتی ہوں۔ جس کا پہلا ناول A Girl in the Blue جو کہ چارلس ڈکنز کے ناول Great Expectations کو بنیاد بنا کر لکھا گیا تھا۔ بکر پرائز (Booker prize) کی لونگ لسٹ میں منتخب ہوا تھا۔ برطانیہ میں یہ کسی بھی لکھنے والے کے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔ اس کا ناول ہاتھوں ہاتھ لیا گیا جبکہ اس کی دوسری شارٹ اسٹوریز کی کتاب Lets lie together کو اتنا اچھا رسپانس نہیں ملا اور اب وہ پھر

تیسری کتاب ناول ہی لکھ رہی ہے۔ اس لیے کہ یہاں شارٹ اسٹوری کی کوئی خاص مارکیٹ نہیں ہے۔ بقول گینا آرنلڈ ''Serious readers want to read a novel''

مغربی ادب میں شاعری کی مارکیٹ تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ پورے سال میں شاعری کی غالباً دس یا بارہ سے زیادہ کتابیں نہیں چھپتیں۔ شاید اس کی وجہ یہی ہو بقول شخصے ''تعلیم یافتہ معاشروں میں زیادہ نثر ہی لکھی اور پڑھی جاتی ہے۔''

مغرب کے قاری کے مطابق شاعری پڑھنے کی نہیں بلکہ سننے کی چیز ہے یعنی سپیکنگ پوئٹری اور اس طرح اس کا ایمپیکٹ بھی زبردست ہوتا ہے۔ یہ تو وہ حالات ہیں جنہوں نے امریکن قاری کو پوپ اسٹوری کی طرف متوجہ کیا۔

پوپ کہانی کیا ہے؟ (What is a Pop Story)

پوپ کہانی کی تعریف کچھ یوں بیان کی گئی ہے کہ:

1- پوپ کہانی کا پلاٹ مربوط ہونا چاہیے۔ سٹرکچر مضبوط ہو مگر یہ بنیادی نوعیت کی پراثر کہانی ہونی چاہیے۔

2- پوپ کہانی میں پلاٹ یا کردار کہانی کو آگے بڑھائیں۔

3- یہ سادگی اور پرکاری کا اچھا نمونہ ہونا چاہیے۔

4- پوپ کہانی کوئی ادب پارہ نہیں ہوتی کیونکہ یہ کسی ادبی نقاد کے لیے نہیں لکھی جاتی بلکہ عام قاری کے لیے لکھی جاتی ہے۔

5- کہانی تہہ دار نہیں ہونی چاہیے۔

6- ضرورت سے زیادہ تفصیل سے احتراز کریں۔

7- مناسب طوالت ہو یعنی نہ بہت چھوٹی اور نہ بے حد طویل۔

8- کہانی اور قاری کے درمیان رابطہ ہر حال میں برقرار رہنا ضروری ہے۔

''پوپ کہانی لکھتے وقت قلمکار کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ آپ ایک کہانی سنا رہے ہیں کوئی فلسفہ، جدیدیت، مابعد جدیدیت، علامتی یا تجریدی تجربہ نہیں کر رہے ہیں۔ بس کہانی ہی ہونی چاہیے۔ اپنے مخصوص ماحول اور حالات کے اندر کہانی ہی سب کچھ ہے یعنی "You are telling a story, that's all"

دوسرے لفظوں میں پوپ اسٹوری اور پوپ میوزک میں کوئی واضح تعلق سامنے نہیں آسکا ماسوائے کہ اسے پوپ اس کے پاپولر ہونے کیوجہ سے کہا گیا ہے کیونکہ یہ عوام الناس کے لیے لکھی جاتی ہے اور ان میں بے حد مقبول ہے۔

یہ تو رہی میری تحقیق و جستجو کی داستان..... مگر میں نے یہ ضروری خیال کیا کہ میں امریکن لٹریچر میں لکھی جانے والی پوپ اسٹوری میں سے کچھ کہانیاں نمونے کے طور پر اردو ادب کے قارئین اور قلمکاروں کے لیے پیش کروں تا کہ پوپ کہانی کے بارے میں چھڑی ہوئی بحث میں اس کہانی کے خدوخال واضح کرنے میں کچھ مدد ملے۔

دریں اثنا ای بک (E-book) پر امریکن رائٹر کنگ وینکلس (King Wenclas) کی کتاب "Ten Pop Stories" میری نظر سے گزری تو میں نے یہ کتاب خرید کر ڈاؤن لوڈ کی۔ ان کہانیوں کو پڑھا اور ان میں سے دو کہانیاں مشین (Machine) اور سرخ دروازہ (Red Door) اردو ترجمے کے لیے منتخب کرلیں مگر میں مغرب میں کاپی رائٹس (Copy rights) کی سچوایشن سے پوری طرح باخبر تھی اس لیے بغیر پبلشر یا رائٹر کی اجازت کے میں ان کہانیوں کو ترجمہ نہیں کرنا چاہتی تھی مبادا مستقبل میں کوئی

مسئلہ کھڑا ہو جائے۔ چنانچہ میں نے پبلشر کے نام ای میل مورخہ 14 فروری 2012ء کو بھیجتے ہوئے لکھا کہ:

''میں نے حال ہی میں ای بک پر کنگ وینکلس کی دس پوپ کہانیاں پڑھی ہیں میں خود بھی اردو زبان میں شاعری اور نثر لکھتی ہوں میری خواہش ہے کہ میں کنگ کی چند پوپ کہانیاں اردو میں ترجمہ کر کے اپنے قلمکاروں اور قارئین کے لیے پیش کروں تاکہ اس بات سے آگاہی حاصل کی جا سکے کہ امریکن لٹریچر میں پوپ کہانی کیسے لکھی جا رہی ہے اور ہم امریکن پوپ کہانی کے ماڈل سے اردو ادب میں پوپ کہانیاں لکھتے ہوئے کس طرح استفادہ کر سکتے ہیں۔''

مورخہ 18 فروری 2012ء کنگ وینکلس کی جوابی ای میل موصول ہوئی کہ:

''آپ کی ای میل اور میری پوپ کہانیوں کو پسند کرنے کا شکریہ۔ میں چند سوالوں کے آپ سے جواب چاہتا ہوں۔

☆ آپ نے دس پوپ کہانیاں کیسے اور کہاں تلاش کیں؟

☆ آپ نے کتاب کب اور کہاں سے خریدی؟

☆ ان کہانیوں کے تراجم کون کرے گا؟

☆ ان تراجم کو آپ کہاں پیش کرنا چاہیں گی؟ وغیرہ وغیرہ''

میں نے جوابی طویل ای میل مورخہ 20 فروری 2012ء کو کنگ وینکلس کو لکھتے ہوئے کہا کہ:

''آپ کے جواب کے لیے بے حد مشکور ہوں۔ میں کچھ عرصے سے پوپ کہانیاں پڑھنے میں کافی دلچسپی رکھتی ہوں مگر کہیں سے پوپ کہانیوں کی نشاندہی نہیں ہو رہی تھی۔ پوپ کہانی پر ریسرچ کے دوران انٹرنیٹ پر آپ کی "Ten Pop Stories" میری نظر سے گزریں۔ میرے خیال میں ایمزن کی ویب سائٹ تھی میں نے کتاب خرید کر ڈاؤن لوڈ کر لی مگر آپ کی پوپ کہانیاں میں پرنٹ کرنے سے قاصر تھی۔ (شاید تمام ای بکس کی کہانیوں کے ساتھ ایسا ہی معاملہ رہا ہوگا) آپ کی چند کہانیاں بہت دلچسپ لگیں اور میری خواہش ہے کہ میں انہیں اردو میں ترجمہ کر کے اردو زبان وادب کے قارئین اور قلمکاروں کے لیے پیش کروں کہ امریکی ادب میں پوپ کہانی کے خدوخال کیا ہیں کیونکہ امریکہ میں یہ ایک نہایت پاپولر فارم آف آرٹ ہے۔ میں خود ان کہانیوں کا ترجمہ کروں گی۔ میں اس وقت خود بھی پوپ کہانیاں لکھنے کے مرحلے سے گزر رہی ہوں اور بہت ممکن ہے کہ انہیں جلد ہی کتابی شکل میں شائع کرواؤں۔ آپ کی پوپ کہانیاں اس کتاب میں آپ کے نام کے ساتھ شائع کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو۔ یہ کتاب اردو زبان میں شائع ہوگی اگر آپ پسند فرمائیں تو آپ کو کتاب کی ایک جلد ارسال کر دوں گی جب کتاب چھپ جائے گی تو۔ مجھے امید ہے کہ میں نے آپ کے تمام سوالوں کے تسلی بخش جواب دیئے ہوں گے تاہم اگر اس بارے میں آپ مزید معلومات کے متمنی ہوں تو براہ

کرم رابطے میں تردّد نہ کریں۔ جلد جواب دینے کے لیے ایک بار
پھر نہایت مشکور ہوں آپ کے جلد جواب کی منتظر رہوں گی کیونکہ
میں جلد ہی بیرون ملک سفر کا ارادہ رکھتی ہوں۔"

میری ای میل کے جواب میں کنگ وینکلس کا جواب مورخہ 22 فروری کو موصول ہوا اور انہوں نے مجھے اپنی پوپ کہانیاں ترجمہ کرنے کی اجازت اس وعدے کے ساتھ دے دی کہ میں ان کے نام اور کام کو Acknowledge کروں اور ساتھ ہی انہوں نے میری پوپ کہانیوں کی کتاب کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ کنگ کو بھیجی گئی میری آخری ای میل حوالے کے لیے موجود ہے۔

Dear Mr. Wenclas

"Thank you very much for allowing me to translate some of your work. I really appreciate. I have selected two pop stories ie Machine and Red Door for translations and I hope it gives some idea to the Urdu readers as well as the writers as to what is a true pop story."

Warm Regards

Dr. Razia Ismail

Birmingham. England. UK

میرے خیال میں اس سوال کا جواب ہنوز تشنہ ہے کہ آخر ہم اپنے مخصوص حالات اور ماحول میں اردو ادب میں پوپ کہانی کس طرح سے لکھیں یا کس طرح سے اس کی ایک الگ پہچان بنائیں کہ ہمیں اس کے ساتھ کسی سابقے یا لاحقے کی ضرورت پیش نہ آئے اور بادی النظر میں ہی معلوم ہو جائے کہ یہ پوپ کہانی ہے۔ جیسے اردو

میں ناول، افسانہ، رپورتاژ، کالم، سفرنامہ وغیرہ وغیرہ اپنی ہیئت سے ہی اپنی صنف کا پتہ دے دیتے ہیں یعنی کہ ''لفافہ دیکھ کر مضمون خط کا بھانپ لیتے ہیں''

اس ضمن میں سوچ کے کچھ زاویے ہیں جن پر مزید غور وخوض کیا جا سکتا ہے مثلاً:

1- کیا مشرق کے مخصوص حالات اور ماحول میں لکھی جانے والی پوپ کہانی کو کسی طرح مشرقی کلاسیکی موسیقی سے منسلک کیا جا سکتا ہے جو کہ ممکن ہے مشرق میں اس کی ایک الگ پہچان بنانے میں ممدومعاون ثابت ہو سکے؟

2- یا پھر ہم امریکن لٹریچر میں وضع کردہ خدوخال کے مطابق ہی پوپ کہانیاں لکھیں؟

3- یا پھر صرف ایسی کہانی کو پوپ کہانی کا درجہ دیا جائے جو کسی مخصوص مغربی سوچ یا فلسفے کی غمازی کرتی ہو۔

4- اس کے کردار بے شک مشرقی ہوں مگر مغرب سے انکا تعلق کسی نہ کسی انداز سے واضح ہوتا ہو یا وہ مغربی معاشرے میں رہ رہے ہوں یا رہ چکے ہوں یا ان کے تجربات مغربی معاشرے یا سوچ سے متعلق ہوں۔

5- عام اردو تحریر کے برعکس کیا انگریزی الفاظ کے بکثرت استعمال سے پوپ کہانی کی الگ پہچان بنائی جا سکتی ہے یا نہیں؟ (اسی خیال کے پیش نظر میں نے اپنی لکھی ہوئی پوپ کہانیوں میں انگریزی الفاظ بکثرت استعمال کیے ہیں) مگر یہ معاملہ بحث طلب ہے کہ ایک عام قاری (جس کے لیے کہانی لکھی جا رہی ہے) اگر اس کا انگریزی زبان کا علم محدود ہے تو کیا وہ اس سے حظ اٹھا سکے گا؟

میں نے نمونے کے طور پر کنگ وینکلس (امریکن پوپ سٹوری رائٹر) کی دو

کہانیوں کے تراجم شامل کتاب کیے ہیں اور خود بھی امریکن لٹریچر میں دی گئی پوپ کہانی کی تعریف وتجاویز کے اتباع میں بارہ پوپ کہانیاں لکھی ہیں۔ میں اپنی اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوئی ہوں۔ اس کا فیصلہ میں آپ سب پر چھوڑتی ہوں کیونکہ یہ کہانیاں لکھتے وقت میرے پیش نظر صرف کہانی اور قارئین تھے۔ میرے نزدیک یہ کہانیاں قاری اور رائٹر کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایک مخصوص ماحول اور حالات کے اندر لکھی گئی (یہ تجرباتی کہانیاں) میری آپ کی اور ہم سب کی یعنی زندگی کی کہانیاں ہیں۔ زندگی ایک تجربہ گاہ ہے اور میرے خیال میں تجربے میں بہتری اور نکھار کی گنجائش ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ شکریہ!

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل
برمنگھم، برطانیہ
24 فروری 2012ء

پوپ کہانی اور رضیہ اسماعیل کی کہانیاں

گزشتہ کچھ عرصہ سے پوپ کہانی کا نام سننے میں آرہا تھا۔ادھراُدھر ادبی رسائل میں عام طور پر افسانچہ طرز کی کہانیاں چٹکلے کے انداز میں دکھائی دے رہی تھیں۔جوگندر پال کے افسانچے پڑھنے کے بعد کسی چٹکلا نما چیز کی طرف دھیان دینے کا موڈ ہی نہ بنا۔لیکن حال ہی میں مقصود الٰہی شیخ کے ساتھ ایک طویل وقفہ کے بعد رابطہ ہوا تو انہوں نے پوپ کہانی کی جانب توجہ دلائی۔نہ صرف توجہ دلائی بلکہ اپنی کتاب ''پوپ کہانیاں'' بھی عنایت کردی۔عجیب اتفاق ہے کہ عین انہیں دنوں میں جب ہماری مراسلت جاری تھی مجھے ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی حال ہی میں شائع ہوئی شعری کلیات ''خوشبو،گلاب،کانٹے'' کا تحفہ ملا۔اس میں رضیہ اسماعیل کی کتابوں کی لسٹ دیکھ رہا تھا تو سال ۲۰۱۲ء میں ان کی کتاب ''کہانی بول پڑتی ہے''(پوپ کہانیاں)،کا نام دیکھ کر چونک گیا۔ان سے رابطہ کیا کہ مجھے یہ کتاب درکار ہے۔پھران کے ساتھ اس موضوع پر تھوڑی سی گفتگو بھی ہوئی۔مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ جو سوالات میرے لیے الجھن کا باعث بنے ہوئے ہیں،وہ کہیں زیادہ رضیہ اسماعیل کے لیے بھی الجھن کا باعث بنے ہیں۔اورانہوں نے ان سوالات کے جواب تلاش کرنے کے لیے پوپ کہانی کے مرکز امریکہ کے انگریزی پوپ کہانی نگاروں سے بھی رابطے کیے تاکہ اگر یہ کوئی نئی صنف ہے تو اس کے خدوخال دوسروں سے الگ دیکھے جا سکیں۔ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے بتایا کہ اُن کی کتاب ''کہانی بول پڑتی ہے'' پبلشر کے پاس ہے اور پروف ریڈنگ کی وجہ سے اشاعت میں دو تین ماہ کی تاخیر ہورہی ہے۔میری درخواست پر انہوں نے مجھے اس کتاب کی ان پیج فائل عنایت کردی۔یوں مجھے پوپ کہانی کے مسئلہ کو برطانیہ کے دو

تخلیق کاروں کے کام کے تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کا تھوڑا سا موقعہ مل گیا۔

مقصود الٰہی شیخ کے ساتھ میری جو مراسلت ہوئی، اس میں میری طرف سے ایک دو بنیادی سوال اٹھائے گئے تھے۔ مراسلت کے نتیجہ میں بھی اور کتاب ''پوپ کہانیاں'' کو پڑھنے کے بعد بھی مجھے نہ صرف ان سوالات کے جواب کی ابھی تک تلاش ہے بلکہ ان کے ساتھ مزید چند سوالات بھی پیدا ہو گئے ہیں۔

۱۔ پوپ کہانی کے بنیادی خدوخال کیا ہیں؟

۲۔ جس طرح افسانچہ، افسانہ، ناولٹ اور ناول کی پہچان بالکل سامنے کی بات اور قابلِ فہم ہے، اسی طرح پوپ کہانی کو افسانچہ یا افسانہ سے کس طرح الگ پہچانا جا سکتا ہے؟ کسی مابہ الامتیاز اور کسی تخصیص کے بغیر پوپ کہانی کو افسانچہ یا افسانے سے الگ کر کے کیونکر دیکھا جا سکتا ہے؟

مقصود الٰہی شیخ کی پوپ کہانیوں میں بعض افسانچوں کی طرح ہیں، بعض نثری نظم کے انداز میں، بعض میں خلیل جبران جیسا رنگ در آیا ہے تو بعض ڈرامہ کے طور پر بیان ہوئی ہیں۔ اس ہیئتی منظر نامہ سے مسئلہ سلجھنے کی بجائے مزید الجھ جاتا ہے۔

چونکہ پوپ کا لفظ پاپولر میوزک والے پوپ سے لیا گیا ہے۔ اس پر ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے تو ایک اور نکتہ اٹھا دیا ہے کہ اگر یہ تعلق کسی موسیقیت کی بنیاد پر ہے تو پھر اردو میں پوپ کہانی کو کلاسیکی موسیقی کے ساتھ بھی جوڑا جا سکتا ہے۔ ان کے بقول: ''اگر پوپ کہانی لکھتے وقت اسے کسی نہ کسی راگ یا راگنی کے تابع کر دیا جائے یا اس سے منسلک کر دیا جائے تو شاید ہمیں پوپ کہانی کی ہیئت، تکنیک یا فارمیٹ کو مشرق میں ڈویلپ کرنے میں، اس کی الگ پہچان بنانے میں کوئی کامیابی ہو سکے''۔

لیکن اگر یہ لفظ محض پاپولر کہلانے کی خواہش کا اظہار ہے تو بات بنتی دکھائی نہیں دیتی۔ کیونکہ پریم چند سے لے کر منٹو تک ہمارے ابتدائی اور اہم لکھنے والوں کی کہانیاں تو اردو میں مقبولیت کے سات آسمان چھو چکی ہیں۔ اور آج بھی کہانی پڑھنے والوں میں مقبول ہیں۔ ان سے زیادہ پاپولر کہانیاں کس نے لکھی ہیں!

پوپ کہانی کے بنیادی خدوخال کو واضح کیے بغیر اور افسانہ و افسانچہ سے اسے الگ

دکھائے بغیر اس کی شناخت کا مسئلہ پہلے قدم پر ہی رکا رہے گا۔ جہاں تک دوسرے بیان کردہ اوصاف کا تعلق ہے۔ مثلاً مقصود الٰہی شیخ کے بقول: ''پوپ کہانی، افسانہ، افسانچہ یا پارۂ لطیف سے یکسر جدا ہے۔ کچھ ہے تو اپنے گوناں گوں موضوعات اچانک آمد پر قلمبند کرنے کا نام ہے۔ جب قلم سے جڑا احساس دل کسی واردات کو تحریک و فیضان ملنے یا انسپائر ہونے پر سینے میں بند رکھنے کی بجائے عام فہم لفظوں میں سپردِ قرطاس کر دے تو لفظوں کا یہی روپ پوپ کہانی ہے''۔۔۔

ان اوصاف کی تو تخلیقی ادب کی تمام اصناف میں ایک جیسی اہمیت اور حیثیت ہے۔ اچانک آمد پر کچھ لکھنا یا کسی واردات کو تحریک ملنے پر لکھ دینا صرف فکشن میں نہیں دوسری تمام تخلیقی اصناف میں بھی ہوتا رہتا ہے۔ مقصود الٰہی شیخ نے ''عام فہم لفظوں'' میں لکھنے کا ذکر بھی کیا ہے۔ انہوں نے خود زندگی بھر جو لکھا ہے وہ سارا عام فہم ہی ہے۔ سو یہ ساری لفظیات ادب کی جملہ اصناف پر عمومی طور پر لاگو کی جا سکتی ہے۔ مجھے احساس ہے کہ مقصود الٰہی شیخ بعض مخالفین کی مخالفت کے باعث اس موضوع پر لکھتے ہوئے تھوڑا سا غصہ میں آ جاتے ہیں۔ تاہم میں امید کرتا ہوں کہ وہ ایک مضمون ایسا ضرور لکھیں گے جس میں اپنے مخالفین کو یکسر نظر انداز کر کے ان لوگوں کے لیے پوپ کہانی کے خدوخال کو بیان کریں گے جو نیک نیتی کے ساتھ پوپ کہانی کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ تاکہ وہ سمجھ سکیں کہ پوپ کہانی، افسانہ اور افسانچہ سے کیونکر مختلف اور الگ ہے۔ اور اس کی کون سی خصوصیات ہیں جو ادب کی دوسری اصناف سے مختلف ہیں۔ یہ اعتراض نہیں، سوالات ہیں اور ان کا مقصد پوپ کہانی کی شناخت کو واضح طور پر سمجھنا ہے۔ کیونکہ عام فہم لفظوں میں لکھی جانے والی صنف کی شناخت بھی عام فہم/ قابلِ فہم ہونی چاہیے۔

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل برطانیہ کے لکھنے والوں میں اپنی الگ پہچان رکھتی ہیں۔ شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کا نتیجہ تو ان کے پانچ شعری مجموعوں کی کلیات کی صورت میں سامنے آ چکا، جس کا ذکر شروع میں کر چکا ہوں۔ نثر میں ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ''چاند میں چڑیلیں'' سال ۲۰۰۰ء میں چھپ گیا تھا۔ ان کے لکھے ہوئے متفرق تاثراتی مضامین اِدھر اُدھر مطبوعہ صورت میں موجود ہیں۔ اور اب پوپ کہانی کی جستجو میں انہوں نے

اپنے افسانوں کا مجموعہ ''کہانی بول پڑتی ہے'' تیار کرلیا ہے۔ اپنے تحریر کردہ پیش لفظ ''پوپ میوزک سے پوپ کہانی تک'' میں انہوں نے پوپ کہانی کے مسئلہ پر کسی جذباتیت کے بغیر اس کے خدوخال کو سمجھنے کی کاوش کی ہے۔ امریکہ میں پوپ کہانی کو کیسے سمجھا اور سمجھایا جارہا ہے؟ اس کا بیان بھی اس پیش لفظ میں مل جاتا ہے۔ ''پوپ کہانی کیوں؟'' اور ''پوپ کہانی کیا ہے؟'' کے ذیلی عناوین کے تحت انہوں نے مغربی تناظر میں پوپ کہانی کا مسئلہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ پوپ کہانی کیوں؟ میں تو جدید تر میڈیائی چیلنجز کے سامنے افسانے کی بے بضاعتی کا ذکر ہے۔ لوگ ناول پڑھ لیتے ہیں لیکن افسانہ کی طرف دھیان نہیں دیتے۔ (میڈیائی یلغار ہی صرف مسئلہ ہے تو پھر ناول کیوں پڑھا جارہا ہے؟)، شاعری تو بہت پہلے سے نظر انداز کی جا چکی ہے، وغیرہ۔ جدید تر میڈیائی یلغار بلاشبہ ایک اہم مسئلہ ہے۔ اس کے سامنے صرف افسانہ نہیں، پورا ادب ہی نظر انداز ہوتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ اس چیلنج سے عہدہ براء ہونے کے لیے ''پوپ کہانی'' نام رکھ لینے سے لوگ اس طرف راغب نہیں ہوں گے۔ اس کے لیے ادب کی مجموعی اور عالمی صورت حال کے پس منظر میں ہی سب کو اپنے اپنے حصہ کا کردار ادا کرنا ہوگا۔ یہ موضوع بجائے خود ایک الگ مکالمہ اور الگ بحث کا تقاضا کرتا ہے۔ اس چیلنج سے نمٹنے کے لیے عام کہانی کا نام پوپ کہانی رکھ دینا مناسب نہیں۔ رضیہ اسماعیل نے مشرقی موسیقی کے سامنے پوپ کہانی کو ''لولی لوپ'' قرار دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جدید تر میڈیائی چیلنجز کے سامنے پوپ کہانی کو پیش کرنا بھی ''لولی پاپ'' دینے کے مترادف ہے۔

''پوپ کہانی کیا ہے؟'' کے تحت مغربی دنیا کے پوپ کہانی والے اسے جن اوصاف کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کررہے ہیں، وہ سب عمومی اوصاف ہیں، جنہیں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ادب کی جملہ اصناف میں دیکھا جاسکتا ہے۔ مجھے ایسے لگتا ہے کہ ادب کو درپیش نئے چیلنجز کے سامنے بعض لکھنے والے سراسیمگی کی کیفیت میں ہیں۔ ایک پاپ اسٹار کی مقبولیت کے سامنے اپنی انتہائی عدم مقبولیت سے دل برداشتہ ہو کر بعض ادیبوں نے جیسے پوپ کہانی کی راہ اپنالی ہے۔ صرف کہانی کیوں؟ آپ ادب کی ساری اصناف کو بھی پوپ کے سابقہ کے ساتھ جوڑ لیجیے۔ لیکن اس سے مقبولیت تو ملنے سے رہی۔ ادب کے دیار

میں قبولیت اور مقبولیت دونوں کی اپنی اپنی جگہ ہے۔ کسی ادیب کو اچھا لکھنے کی توفیق مل جانا، قبولیت کے زمرہ میں آتا ہے اور ایک اچھے ادیب کے لیے توفیق مل جانا ہی بڑی بات ہے۔ مقبولیت ایک دوسرا موضوع ہے۔ سر، دست اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ قناعت پسند ادیب قبولیت پر ہی خوش رہتے ہیں۔ آگے جو ملے، نہ ملے، توفیق دینے والے کی مرضی۔

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے امریکہ کے پوپ کہانی لکھنے والے ایک مصنف کنگ وینکلس سے رابطہ کیا اور ان کی دو منتخب پوپ کہانیوں کو اپنے مجموعہ میں شامل کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔ ''مشین'' اور ''سرخ دروازہ'' کے نام سے ترجمہ کی گئی ان دونوں کہانیوں کا ترجمہ اسماعیل اعظم نے بہت عمدگی سے کیا ہے۔ ان دونوں کہانیوں کو پڑھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ یہ دونوں کہانیاں نیم علامتی پیرائے میں لکھی ہوئی ہیں۔ اور وہ جو پوپ کہانی کا مطالبہ تھا کہ کہانی عام فہم لفظوں میں ہو، وہ یہاں پوری طرح ادا نہیں ہوتا۔ کہانی ''مشین'' سے مجھے ایسا لگا کہ کنگ وینکلس نئے لکھنے والے ہیں۔ ان میں صلاحیت ہے لیکن ابھی تک ادب کی بڑی سطح پر ان کا اعتراف نہیں کیا گیا، یا مناسب پذیرائی نہیں کی گئی۔ چنانچہ وہ بڑے لکھنے والوں اور اہم نقادوں کو کہانی میں تمسخر کا نشانہ بناتے ہیں۔ ''سُرخ دروازہ'' مختلف رنگوں کی علامات کے سہارے کہانی کو دلچسپ اختتام تک پہنچاتا ہے۔ دونوں کہانیوں سے ایسا تاثر بھی ملتا ہے کہ امریکہ میں آزادیٔ اظہار کے باوجود بہت کچھ کہنے میں مسائل کا سامنا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ کنگ وینکلس نے علامات کا سہارا لے کر اپنے مخصوص نیم علامتی پیرائے میں اپنے دل کی بات کہہ دینے کی کوشش کی ہے۔ ''مشین'' میں تو نیم علامتی پیرایہ نیم سے کچھ زیادہ کھلتا دکھائی دیا تو انہیں آخر میں یہ اضافی نوٹ دینا پڑ گیا: ''اس کہانی میں جس سوسائٹی کی منظرکشی کی گئی ہے۔ امریکی معاشرے سے اس کی کوئی مماثلت نہیں ہے۔''

کنگ وینکلس کی دو کہانیوں کے بعد ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے اپنی بارہ کہانیاں شامل کی ہیں۔ ان کی پہلی کہانی ''تھرڈ ورلڈ گرل'' کے اختتام تک پہنچا تو ایسا لگا کہ سچ مچ کوئی گونگی کہانی بول پڑی ہے۔ ''ائر فریشنر'' صرف برطانیہ ہی کی نہیں اب تو یورپ بھر کے پاکستانیوں کی مجموعی فضا کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اور ''آنر کلنگ'' پڑھتے ہوئے ایسے لگا کہ

کہانی صرف بول نہیں پڑتی بلکہ بعض اوقات چلّاتی بھی ہے۔قبل از اسلام کے مکہ میں زندہ گاڑدی جانے والی بیٹیوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں بھی جیسے اکیسویں صدی کی انوکھی آنر کلنگ میں شامل ہوگئی ہیں۔تب اس ظلم کو غیرت کے جاہلانہ تصور پر تحفظ حاصل تھااور اب اسے خود مذہب کے نام پر تحفظ حاصل ہے۔''تھرڈ ڈائمنشن''برطانیہ میں اسائلم لینے کی سہولتوں سے سچ جھوٹ بولنے کی کسی حدتک چلے جانے والوں کی دلچسپ کہانی ہے۔باقی ساری کہانیاں بھی اپنی اپنی جگہ دلچسپ ہیں۔''ریڈیو کی موت''کہانی کو میں نے یہ سمجھ کر پڑھنا شروع کیا تھا کہ سیٹلائٹ اور ٹیلی ویژن چینلز کی نت نئی کرشمہ سازیوں کے سامنے ریڈیو کے دَم توڑنے کی کہانی ہوگی۔لیکن یہ تو ایک بھلی مانس سی کہانی نکلی۔لیکن اپنی بھل منسیٔ کے باوجود کہانی اچھی ہے۔''کہانی بول پڑتی ہے''میں شامل ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی بارہ کہانیاں ان کے اندر کی افسانہ نگار کا پتہ دیتی ہیں۔یہ کہانیاں برطانیہ میں مقیم پاکستانیوں کی مختلف النوع کہانیاں ہیں۔خامیاں اور خوبیاں،دوسروں کی ہوں یا اپنوں کی،ان سب کو ایک توازن کے ساتھ نشان زد کیا گیا ہے۔کہیں کہیں تبلیغی رنگ غالب ہونے لگتا ہے لیکن صرف ایک دو کہانیوں میں ایسا ہوتا ہے۔بیشتر کہانیوں کا اختتام جیسے ہلکا سا ادھورا چھوڑ دیا جاتا ہے،لیکن یہ عمل کسی نوعیت کا ابہام پیدا نہیں کرتا،بلکہ قاری خود کہانی میں شریک ہو کراسے مکمل کرلیتا ہے،کیونکہ اختتامی ادھوراپن ایک واضح اشارا چھوڑ جاتا ہے۔اس سے کہانی کا سادہ بیانیہ ایک رنگ میں علامتی سا بن جاتا ہے۔

مجموعی طور پر ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی یہ کہانیاں اردو افسانے کے سفر کا تسلسل ہیں۔افسانہ غیر مقبول ہے یا سارا ادب ہی غیر مقبول ہوتا جارہا ہے؟وہ مقبولیت کے کسی پھیر میں نہیں پڑیں۔ان کے لیے اتنا ہی بہت ہے کہ انہیں یہ کہانیاں تخلیق کرنے کی توفیق مل گئی۔قبولیت نصیب ہوگئی۔توفیق ملنے کی اس قبولیت پر میری طرف سے دلی مبارک باد!

حیدر قریشی

مدیر **جدید ادب** جرمنی

۱۴رمئی ۲۰۱۲ء

خواندنی اور جاذبِ نظر کہانیاں

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نظم ونثر میں کہانیوں کے زیرنظر مجموعے ''کہانی بول پڑتی ہے'' سے پہلے بھی بہت کچھ تصنیف کر چکی ہیں لیکن یہ مجموعہ کئی خصوصیات کے باعث خصوصی توجہ کا طالب ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ نے ان کہانیوں کو'پوپ سٹوریز' کا نام دیا ہے اور پیش لفظ میں اس اصطلاح کے مفہوم پر سیر حاصل بحث بھی کی ہے۔ پوپ سٹوریز درحقیقت پوپ میوزک کے زیر اثر وجود میں آنے والی اصطلاح ہے۔ دونوں میں قدر مشترک صرف مقبولیت ہے۔ مصنفہ امریکی پوپ سٹوری رائٹر کنگ وینکلس (King Wencles) سے متاثر ہوئی ہیں مگر یہ کہانیاں علامتی ہیں جبکہ ڈاکٹر صاحبہ کی کہانیاں واقعات کو براہِ راست اور اکہرے انداز میں بیان کرتی ہیں جن کے کردار خصوصاً نسوانی کردار ایک خاص کشش کے حامل ہیں۔ یہ پڑھی لکھی، ذہین، متجسس، دلکش اور متنوع صلاحیتوں کی حامل لڑکیاں ہیں جو اکثر شادی کے بعد انگلینڈ میں سکونت پذیر ہوگئی ہیں مگر ابھی اپنی روایات، عقائد اور اندازِ بود و ماند میں بہت حد تک پاکستانی ہیں۔ وہ اپنے نئے ملک میں نسلی تفاوت اور ماحول کی اجنبیت سے دوچار ہیں مگر ان میں سے بعض رفتہ رفتہ اپنا راستہ بنانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں جبکہ کچھ ایسی بھی ہیں جو کسی نہ کسی وجہ سے نئے ماحول سے ہم آہنگ نہیں ہو پاتیں اور مشکلات کا شکار رہتی ہیں۔

یورپ اور امریکہ میں مقیم متوسط طبقے کے پاکستانی تارکینِ وطن کے کئی مسائل مزاجی تضادات ان کہانیوں میں منعکس ہوئے ہیں اور ہمیں غور و فکر پر مجبور کرتے ہیں۔

ان کہانیوں میں سے اکثر کے عنوانات انگریزی میں ہیں اور اسلوب میں بھی جگہ جگہ انگریزی الفاظ کا سہارا لیا گیا ہے لیکن یہ سب اس لیے بُرا معلوم نہیں ہوتا کہ جس ماحول کی عکاسی کی گئی ہے اس کے لیے یہ بہت حد تک ضروری ہے تاہم ڈاکٹر صاحبہ جہاں خالص اردو میں لکھتی ہیں وہاں اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ رواں اور زبانِ اردو کے مزاج کے مطابق نثر لکھنے پر بھی قدرت رکھتی ہیں۔

مصنفہ کے نزدیک 'پوپ کہانیاں' دلچسپی کے عنصر کی حامل ہونی چاہئیں اور یقیناً اس مجموعے کی ہر کہانی اتنی دلچسپ ہے کہ سہولت کے ساتھ دس پندرہ منٹ میں آسانی سے پڑھی جا سکتی ہے۔ پاپولر لٹریچر کا بڑا مقصد یہی ہوتا ہے۔ یہ قاری کو فلسفیانہ، مابعدالطبیعاتی اور گہرے نفسیاتی مسائل میں الجھانے کی بجائے وہی کچھ پیش کرتا ہے جو دلچسپی برقرار رکھے۔ اس قسم کے ادب کا قاری کبھی کبھی ''پاپولر' کی حد کو عبور کر کے گھمبیر مسائل پیش کرنے والے ادب کی طرف پیش رفت کر جاتا ہے۔

بہرحال میں نے ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی ان کہانیوں کو بہت دلچسپی توجہ طلب اور جاذب پایا ہے اور امید ہے کہ دیگر پڑھنے والے بھی انھیں خواندنی (Readable) اور جاذبِ نظر پائیں گے۔

خواجہ محمد زکریا
پروفیسر امریطس (اردو)
پنجاب یونیورسٹی، لاہور

'پوپ کہانی' از کنگ وینکلس

اُردو ترجمہ: اسماعیل اعظم

مشین

(The Machine)

یہ بات قدرے حیران کن تھی کہ فنلے بڑا ہو کر ایک رائٹر بننا چاہتا تھا۔ اس کا تعلق ایک آسودہ حال مڈل کلاس گھرانے سے تھا جہاں کتاب کو فنون لطیفہ کا درجہ حاصل تھا۔ کتاب کو سنبھال کر رکھنے اور اس کی اچھی طرح سے دیکھ بھال کرنے کو ایک اہم فریضہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کے پڑوس میں بچوں کو اپنے گھروں سے باہر کھیلنے کی اجازت نہیں تھی۔ کیونکہ اس میں کسی قسم کے خطرات تھے۔ دیگر بچوں کی طرح وہ بھی گھر کے اندر زیادہ تر کمپیوٹر سکرین پر ہی مصروف رہتا۔ تاہم اس نے اس ماحول سے بغاوت کا اعلان اپنے والدین کی احتیاط سے جمع شدہ کتب کے مطالعہ سے شروع کیا۔ وہ کتابیں پڑھنے کے بعد انہیں اس قدر احتیاط سے صاف کر کے رکھتا کہ اس کی انگلیوں کے نشان تک ان پر نظر نہیں آتے تھے۔

بس اس کتب بینی کے دوران ہی اُس نے ارادہ کر لیا کہ وہ ایک رائٹر بننا چاہتا تھا۔ مقامی کالج سے رائٹر ٹریننگ کا امتحان اُس نے بہت اچھے نمبروں سے پاس کر لیا۔ گو کہ یہ ٹریننگ کافی مہنگی تھی مگر اس کے مالی طور پر خوشحال والدین کو اس کی پرواہ نہیں تھی۔

اس کے والدین اس کے رائٹر بننے کے فیصلے سے ناخوش تھے کیونکہ یہ فیصلہ ان کی توقعات کے برعکس تھا۔ اس نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی جب وہ پہلے دن رائٹرز ٹریننگ اکیڈمی گیا۔ اس کے والدین نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار الفاظ میں تو نہیں کیا (کیونکہ ساری زندگی انہوں نے کبھی بھی زبانی طور پر ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا تھا) مگر وہ ان کے چہروں کے تاثرات واضح طور پر پڑھ سکتا تھا۔

رائٹر ٹریننگ اکیڈمی بھی کسی فوجی کیمپ سے کم نہ تھی۔ جہاں دوسرے طالب علم اس کی کہانیوں کے خوب خوب بخیے ادھیڑتے اور پھر وہ کہانی کو دوبارہ سے درست کرتا۔ اس نے یہاں ایک بات خاص طور پر سیکھی کہ وہ کیا کہہ سکتا تھا اور کیا نہیں۔ اس سے بھی زیادہ اہم کہ اُسے کیا سوچنا چاہیے اور کیا نہیں سوچنا چاہیے! آخر کار سخت مشقت کے بعد اس نے اپنی ٹریننگ مکمل کر کے ڈگری وصول کی جو کہ حقیقتاً صرف ایک کاغذ کا ٹکڑا ہی تھا۔ مگر اس کا بات کا ثبوت تھا کہ اب وہ ایک رائٹر بن چکا ہے۔ فنلے کو ایک ادبی پوزیشن پر تعینات کر کے ہدایت کی گئی کہ وہ اگلے ہفتے کے آغاز میں لٹریچر بلڈنگ میں رپورٹ کرے۔

لٹریچر بلڈنگ ایک سفید رنگ کی بدہیبت اور بے ہنگم سی عمارت تھی۔ اگر وہاں انٹرس کا سائن نہ لگا ہوتا تو اسے شاید دروازہ بھی نظر نہ آتا۔ عمارت کے اندر داخل ہوتے ہی ایک گائیڈ نے اس کے کوٹ کے کالر پر اس کے نام کی چٹ لگا دی اور اسے اپنے ساتھ آنے کی درخواست کی۔ وہ دونوں سفید راہ داریوں کی بھول بھلیوں میں تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ گائیڈ نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ ”میں مسٹر بینک ہوں اور تمہیں اس بلڈنگ کے بارے میں معلومات دوں گا۔“ وہ دونوں ایلویٹر

کے ذریعے دوسری منزل پر پہنچے۔ مسٹر بینک نے جمپ سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا تاہم اس کی امتیازی خصوصیت اس کے چہرے پر اس کی بڑی بڑی قلمیں اور تنگ شیشوں کی عینک تھی۔ جونہی وہ ایلویٹر سے نکل کر سفید راہ داری میں آئے اس نے دیکھا کہ وہاں سب حضرات نے تنگ شیشوں والی نظر کی عینکیں لگا رکھی تھیں اور ان کی قلمیں بھی مسٹر بینک کی طرح بڑھی ہوئی تھیں۔ جبکہ خواتین نے اپنی امتیازی حیثیت کا مظاہرہ ناک میں نتھتیاں پہن کر کیا ہوا تھا۔

اگلے ہفتے شاید ڈریس کوڈ قدرے مختلف ہوتا۔ تاہم اس ہفتے کا ڈریس کوڈ۔ تنگ شیشوں والی عینکیں، لمبی لمبی قلمیں۔ اور ناک میں نتھیاں تھی۔

فنلے اپنے گائیڈ کے ساتھ ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں تین دروازے تھے جن پر ترتیب وار لکھا ہوا تھا ''ناول'' ''کہانیاں'' اور ''شاعری'' مسٹر بینک نے ناول کی تختی والا دروازہ کھولا تو دیکھا کہ سارا کمرہ رائٹرز سے بھرا ہوا تھا جو کہ کمپیوٹر ٹرمینلز پر پوری تندہی سے کام میں مصروف تھے۔

مسٹر بینک نے کہا کہ ان کا کام ناقابلِ فہم نثر کی طویل کتابیں لکھنا ہے جنہیں لٹریچر بلڈنگ کے باہر کوئی نہیں پڑھتا۔ اچانک مسٹر بینک نے سوال کیا کہ ''کیا تم پچھلی قطار میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہے ہو۔ یہ ناول کے نقاد ہیں۔ ان کا کام ناقابل فہم نثر کے طویل تنقیدی مضامین لکھنا ہے جنہیں لٹریچر بلڈنگ کے باہر کوئی بھی پڑھنا پسند نہیں کرتا۔ تم دیکھ رہے ہو کہ یہ صرف تین افراد پر مشتمل گروپ ہے۔''

اب دونوں اس دروازے کی جانب بڑھ رہے تھے جن پر کہانیوں کا سائن لگا ہوا تھا۔ یہ کمرہ ناول لکھنے والے کمرے کی طرح رائٹرز سے بھرا ہوا تھا۔ تاہم یہاں خواتین

کی تعداد مردوں کی نسبت زیادہ تھی جبکہ ناول روم میں مردوں کی تعداد خواتین سے زیادہ تھی۔ وہ مردوں اور خواتین رائٹرز کے اس تناسبی فرق کو بالکل نہ سمجھ سکا۔ مسٹر بینک نے اسے قدرے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر کہا کہ ''اس کمرے میں صرف گھریلو کہانیاں لکھی جاتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں صرف ایسی کہانیاں جو کہ لٹریچر بلڈنگ کے باہر صرف تھوڑے سے لوگ پڑھتے ہیں۔''

مسٹر بینک نے شاعری کے سائن والا دروازہ کھول کر فوراً ہی بند کر دیا۔ اور منہ سے ایک بے معنی سی آواز نکالی۔ فنلے نے اس فوری عمل کے دوران کمرے کی ایک جھلک دیکھ لی۔ جہاں رائٹرز بڑی سنجیدگی اور محنت سے سفید سفید کاغذوں پر بڑی سرعت سے کچھ لکھ رہے، تھے مگر وہ شاعرانہ کام نظر نہیں آتا تھا۔ مسٹر بینک نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ سب لوگ جان بوجھ کر ڈسپلن کا خیال نہیں رکھتے۔ ان کے کام کا بنیادی نقطہ عام لوگوں کے بارے میں غیر دلچسپ باتیں لکھنا ہے جو کہ کوئی بھی نہیں۔ یہاں تک اس بلڈنگ والے بھی کبھی نہیں پڑھتے۔ اگر تم وہ الفاظ سن لو جو یہ لکھ رہے ہیں تو تم فوراً نیند کی وادیوں میں اتر جاؤ۔ میرے خیال میں لٹریچر بلڈنگ میں ہر فرد ایک نہایت سنجیدہ فن پارے پر کام کر رہا ہے۔ جو کہ میوزیم میں محفوظ کر لیا جائے گا تاکہ آنے والی نسلیں اس سے فیض یاب ہو سکیں۔ تاہم میں اس کمرے کے رائٹرز کے بارے میں اپنی رائے محفوظ رکھوں گا۔'' مسٹر بینک نے ہلکے سے اپنی ایڑھی فرش پر مار کر سر کو جھٹکا دیا اور جو کچھ کمرے میں دیکھا تھا اسے نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

بعد ازاں وہ ایک ایسی راہداری میں پہنچے جہاں کچھ اور دروازے تھے جن پر

مختلف ناموں کی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔ مسٹر بینک نے ان دروازوں کی طرف دیکھتے ہوئے فنلے سے کہا کہ ''ان کمروں میں جانا وقت کا زیاں ہے اور تمہیں شاید اپنی پوری ملازمت کے دوران کبھی اس کی ضرورت نہ پڑے۔ تاہم فنلے نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا جس پر ایڈوکیسی کی تختی لگی ہوئی تھی کہ اس کے بارے میں کچھ بتائیں۔ مسٹر بینک نے اس کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ نہ کوئی ساز وسامان اور نہ ہی کوئی لوگ۔ صرف کمرے کی سفید دیواریں ایک دوسرے کو گھور رہی تھیں۔ ''یہ ایڈوکیٹس کا سیکشن ہے جہاں بیٹھ کر وہ رائٹرز کی تحریروں پر کھلم کھلا اپنی مخالفانہ رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ اس سیکشن کے تمام اعلی عہدیدار موسمی تعطیلات کی وجہ سے ساحل سمندر پر گئے ہوئے ہیں۔''

فنلے نے سوال کیا کہ باقی ملازمین کہاں ہیں۔ مسٹر بینک نے استفہامیہ نظروں سے فنلے کی طرف ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا اور کہا کہ یہاں کوئی بھی نہیں ہے بلکہ پورے ملک میں مخالفانہ رائے رکھنے والا کوئی بھی رائٹر نہیں ملے گا۔ تھوڑا اور چلنے کے بعد وہ ایک اور دروازے کے پاس پہنچے۔ جس پر آویزاں تختی پر درج تھا۔ ''The Club of Insiders'' اور اس تختی کے پیچھے ایک اور چھوٹی تختی لگی ہوئی تھی۔ جس پر تحریر تھا ''Private'' پوری بلڈنگ میں صرف اس کمرے کے اندر سے گہما گہمی کی مدہم سی آوازیں راہداری میں سنائی دے رہی تھیں۔ مسٹر بینک نے دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھول کر دیکھا۔ دونوں نے شراب کے گلاسوں کے آپس میں ٹکرانے کی مدہم آواز اور چرمی صوفوں اور سگار کی ملی جلی باس محسوس کی اور اس کے ساتھ ہی مسٹر بینک نے قدرے زور سے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا کہ یہ ''لوگ بالکل کوئی توجہ نہیں دیتے کہ یہاں کون آیا اور کون گیا، مجھے یقین ہے کہ یہ سب اپنی کسی اگلی سمندری پارٹی کی منصوبہ بندی کر رہے ہوں گے۔ یہ سب لوگ گذشتہ دور کے ادب کی نشانیاں ہیں۔ ان کا سورج اب غروب ہو رہا ہے۔ مسٹر بینک نے کہا کہ

اس سارے سیکشن کو ختم کر دینے کا پروگرام ہے کیونکہ یہ فنڈز کا انتہائی غیر ضروری استعمال ہے۔''

اس دروازے سے تھوڑے فاصلے پر ایک اور دروازہ تھا۔ جس پر آؤٹ سائیڈرز کی تختی لگی ہوئی تھی۔ مسٹر بینک نے وہ دروازہ کھولا تو اس کمرے میں ویسے ہی رائٹرز کمپیوٹر ٹرمینلز پر بیٹھے ہوئے تھے جیسے کہ ساری عمارت میں تھے مگر کسی نے بھی سر اٹھا کر دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ ان سب کی نظریں کمپیوٹر سکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ ''لیکن یہاں آؤٹ سائڈرز بھی رکھنے پڑتے ہیں اور یہ سب آؤٹ سائڈرز ہیں۔'' مسٹر بینک نے وضاحت کی مگر کمرے میں موجود رائٹرز نے اپنی تیز رفتار ٹائپنگ ویسے ہی جاری رکھی جیسی کے ان دونوں کی آمد سے قبل تھی۔

فنلے نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوال کیا کہ دوسرے آؤٹ سائڈرز کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ مسٹر بینک نے قدرے حیرت سے منہ بنا کر پوچھا۔ ''دوسرے کون؟'' فنلے نے وضاحت کی کوشش کی لیکن اسے محسوس ہوا کہ وہ جو پوچھنا چاہتا ہے وہ کہیں اس کے ذہن میں تحلیل ہو رہا ہے۔ تاہم اس نے سرعت سے کہا کہ ''میرا مطلب ہے میں ان آدمیوں کے بارے میں پوچھ رہا ہوں جو اس عمارت کے باہر ہیں۔'' مسٹر بینک نے بڑے استہزائیہ انداز میں کہا ''واقعی کوئی ہیں عمارت سے باہر کیا تم انہیں دیکھ سکتے ہو؟'' فنلے خاموش رہا۔ مسٹر بینک نے پھر پوچھا۔ ''کیا تم انہیں دیکھ سکتے ہو۔'' فنلے نے جواب دیا کہ ''بے شک میں انہیں نہیں دیکھ سکتا کیونکہ اس عمارت میں کوئی کھڑکی ہی نہیں ہے۔'' "Exactly" مسٹر بینک نے جواب دیا۔

ابتدائی تعارف کے بعد فنلے کو ایک اسائنمنٹ دی گئی اور وہ یہ دیکھ کر بے حد خوش ہوا کہ اسے شاعری یا آؤٹ سائڈرز کی بجائے ناول کے سیکشن میں اسائنمنٹ ملی ہے۔ تاہم اسے ایک غیر معینہ مدت تک اپرینٹس کے فرائض انجام دینے تھے۔ فنلے قدرے پریشان سا تھا کہ کہیں ٹریننگ کے دوران اس کے منہ سے یونہی کوئی غلط سلط

بات نہ نکل جائے۔ اگلے روز وہ اپنے نامزد کردہ کمرے میں پہنچا جو کہ عمارت کی بالائی منزلوں میں واقع ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اس نے بھی وہی لباس زیب تن کر لیا جو بلڈنگ میں باقی ماندہ رائٹرز نے پہنا ہوا تھا۔ تنگ شیشوں والی عینک بھی اس نے آنکھوں پر لگائی تھی اور اپنی قلمیں بھی بڑھانی شروع کر دی تھیں۔ وہ اپنے رائٹر سرٹیفکیٹ کو اس دیوار پر آویزاں کرنا چاہتا تھا مگر کوئی صورت نہ نکلنے پر اس نے سرٹیفکیٹ کو اپنے کی بورڈ اور مانیٹر کے درمیان پھنسا کر رکھ دیا۔

اس تمام کارروائی کے بعد فنلے اپنے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ کر اپنے غیر مجتمع خیالات کو ایک شکل دینے کے لیے تیزی سے ٹائپ رائٹر پر اپنے ہاتھ چلانے لگا۔ سب سے پہلے تو اسے اس بات کا شدید افسوس تھا کہ کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ اس کے لیے اپنے ذہن سے کھڑکی کو جھٹک دینا اس قدر آسان نہیں تھا۔ کیونکہ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ بچپن میں اس کے کمرے میں ایک کھڑکی تھی جس سے وہ اکثر باہر کے مناظر دیکھتا رہتا تھا۔ مگر کچھ دیر افسوس کرنے کے بعد اس کے ذہن سے کھڑکی محو ہونے لگی اور اس کے اندر سے کہیں ایک آواز ابھری۔

''کھڑکی کے بغیر تو کوئی کہانی لکھی ہی نہیں جا سکتی!''

☆ (مصنف کی طرف سے تاکیدی نوٹ کہ اس کہانی میں جس سوسائٹی کی منظر کشی کی گئی ہے۔ امریکی معاشرے سے اس کی کوئی مماثلت نہیں ہے)

○

'پوپ کہانی' از کنگ وینکلس

اُردو ترجمہ: اسماعیل اعظم

سرخ دروازہ
(The Red Door)

''سرخ دروازے سے ہشیار رہیں'' "Beware the Red Door"

ایڈم اپنے غبار آلود ذہن سے نشہ آور دوائیوں کے اثرات جھٹکنے کی کوشش میں پوری طرح مصروف تھا مگر اس کے ذہن میں یہ آواز مسلسل گونج رہی تھی۔

وہ سیاہ دیواروں والی نیم روشن راہداریوں میں ٹھوکریں کھاتا ہوا آہستہ آگے بڑھ رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں نو ملی میٹر کا ایک آٹومیٹک پستول تھا۔ یہ ہتھیار اسے کس نے فراہم کیا تھا اور وہ یہاں سے کیسے بچ کر نکل سکے گا؟ ''سرخ دروازے سے ہوشیار رہیں۔'' اس آواز کی بازگشت ایڈم کے ارتعاش زدہ ذہن میں مسلسل گونج رہی تھی اور وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ آواز کس کی تھی۔

ایڈم گرانٹ ایک سابقہ امریکی فوجی تھا جسے سیکرٹ گورنمنٹ انٹیلی جنس ٹریننگ پروگرام کا حصہ بننے پر آمادہ کیا گیا تھا۔

اس ٹریننگ پروگرام میں شمولیت کے بعد ایڈم کو محسوس ہوا کہ ٹریننگ پروگرام چلانے والے اہلکاروں کو یقین ہے کہ ایڈم کے پاس کچھ بہت اہم خفیہ معلومات تھیں

جو اس نے افغانستان میں لڑائی کے دوران حاصل کی تھیں۔

ٹریننگ یونٹ کے کرتا دھرتا نے ایڈم سے اس سلسلے میں کئی سوالات بھی کیے تھے۔ تاہم یہ صرف سوالات نہیں تھے بلکہ ایک باقاعدہ تفتیش تھی۔ جو کہ کنٹرول آفیسر ہنڈرسن کی نگرانی میں ہو رہی تھی۔ مسٹر ہنڈرسن گھنی مونچھوں والا ایک دراز قد آفیسر تھا۔ جو کہ دبیز شیشوں کی عینک استعمال کرتا تھا۔ اسے دیکھنے سے یوں لگتا تھا جیسے اس کے ظاہری چہرے کے پیچھے ایک اور چہرہ چھپا ہوا تھا۔ مسٹر ہنڈرسن اپنی تفتیش کے دوران بار بار یہ فقرہ دہراتا رہا کہ ''تم ہمیں ضرور بتاؤ گے'' اور اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر آنکھیں چندھیا دینے والی تیز روشنیاں ڈال دی جاتیں۔

ایڈم نے اس سے پوچھا کہ ''تم کیا چاہتے ہو؟ اگر مجھے کچھ معلوم ہے بھی تو۔۔۔'' اور اسکے ساتھ ہی اس نے فقرہ نامکمل چھوڑ دیا۔

نشے کے اثرات، غبار آلود ذہن، نہ ختم ہونے والی تیز روشنیاں اور مسلسل بے خوابی، کبھی تو اسے لگتا جیسے ہنڈرسن کی آواز کہیں اس کے اپنے ذہن کی پیداوار تو نہیں۔۔۔ بالکل نہیں۔ پھر وہ یہ خیال ذہن سے یکسر جھٹک دیتا۔ کیونکہ سرخ دروزے کے بارے میں جو آواز اس نے سنی تھی وہ ہنڈرسن کی آواز سے ذرا سی بھی مماثلت نہیں رکھتی تھی۔ اچھی اور بری آواز کے فرق کو وہ واضح طور پر جانتا تھا۔ اچھی آواز جانی پہنچانی سی، قابل بھروسہ حوصلہ بڑھانے والی اور اپنے اندر نرم گرم تمازت رکھتی تھی لیکن وہ ذہن میں مسلسل گونجنے والی آواز کے ماخذ کو پہچاننے میں ناکام تھا۔ عمارت کی بھول بھلیاں سیکرٹ یونٹ کی ٹریننگ کا ایک اہم حصہ تھیں

کیونکہ ٹریننگ یونٹ کے اہل کار چاہتے تھے کہ ایڈم اپنی حرکات وسکنات سے خود اپنی حقیقت آشکارا کر دے۔

مسٹر ہنڈرسن نے اسے خبردار کیا کہ آگے دروازوں کی ایک قطار آرہی ہے جو اسے مختلف آپشنز دے گی۔ تفتیشی افسر کا خیال تھا کہ وہ جو بھی راستہ منتخب کرے گا اور جس طرح کا عمل روا رکھے گا اس سے ان پر اس کی حقیقت کھل جائے گی۔

ایڈم کو لگ رہا تھا کہ جیسے اسے کسی سازش میں ملوث کیا جا رہا ہو۔ ''آخر اس پستول کا کیا مطلب ہے؟'' اس نے خود سے سوال کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے سر کا درد اور بھاری پن یکدم کافور ہو گیا اور وہ اپنی دماغی صلاحیتوں کو مجتمع کرتے ہوئے ایکدم چوکنا ہو گیا۔

ذرا آگے بائیں ہاتھ پر سیاہ دیوار میں ایک نمایاں سفید دروازہ نظر آ رہا تھا۔ ایڈم دروازے کے باہر کھڑا ہو کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ جس پر ایگزٹ یعنی ''باہر نکلنے کا راستہ'' لکھا ہوا تھا۔ ''کیا اسے دروازہ کھولنا چاہیے؟ ان سرخ اور سفید رنگوں کا کیا مطلب ہے'' اسی شش و پنج میں مبتلا ایڈم نے دروازے کے ہینڈل کو چھوا مگر دروازہ نہیں کھولا۔ اس کے بجائے وہ سیدھا آگے کی طرف بڑھ گیا۔ ''کیا وہ یاد رکھ پائے گا اگر اسے سفید دروازے تک پلٹ کر آنا ضروری ہوا تو کیا وہ واپس آ سکے گا؟'' اس نے سوچا اسی اثنا میں سفید دروازہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا اور وہ ایک بار پھر وہاں کی بھول بھلیوں میں گم ہو گیا۔

آگے نظر آنے والا دروازہ سبز رنگ کا تھا۔ یہ سبز رنگ کیوں؟ وہ گہری سوچ میں تھا کہ مخصوص رنگوں کے استعمال کا یقیناً کوئی مطلب ہے اور یہ کسی نہ کسی خاص بات کی

غمازی کرتے ہیں ایڈم نے ذہن پہ زور دیتے ہوئے کہا سوچو ایڈم۔۔۔سوچو کیونکہ اسے یہ احساس تھا کہ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔"Choices" وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے صحیح دروازے کا انتخاب کرلیا تو وہ وہاں سے بچ کر نکلنے میں کامیاب ہو جائے گا۔غلط انتخاب کی صورت میں ایک ٹریجڈی اس کی منتظر تھی۔

وہ مسلسل بھاگ رہا تھا۔اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ایک ہی دائرے میں لگاتار چکر لگا رہا ہے۔اگلا دروازہ۔پھر ایک اور دروازہ۔سفید اور سبز دروازے جنہیں وہ دوبارہ نہیں دیکھ سکا جس سے اسے احساس ہوا کہ وہ کسی دائرے میں چکر نہیں لگا رہا تھا بلکہ مسلسل آگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''سرخ۔۔۔سفید۔۔۔سبز!'' وہ دہراتا جارہا تھا۔''سبز رنگ سے گھاس۔ فطرت اور مٹی یا زمین کا مطلب اخذ کیا جاسکتا ہے اگر سبز رنگ زمین کی نمائندگی کرتا ہے تو پھر سرخ رنگ کو آگ سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔'' ایڈم ان تمام رنگوں کا مطلب ڈھونڈنے کی کوشش میں اپنے ذہن پر بار بار زور دے رہا تھا۔کچھ سمجھ نہ پا کر اس نے خود کو سرزنش کی کہ ''نہیں۔۔۔یہ سب بکواس ہے۔بس ابھی سوچتے رہو۔ سوچتے رہو۔۔۔'' اس نے پھر سے بھول بھلیوں میں بھاگنا شروع کر دیا۔سیاہ اور تاریک راہداری میں سخت گرمی تھی۔شدید حبس میں اس کا دم گھٹ رہا تھا۔پسینے کے قطرے مسلسل اس کے چہرے سے نیچے گر رہے تھے۔اس نے سیاہ رنگ کا سوئٹر اور جین پہن رکھے تھے اور آٹومیٹک پستول پر اس کی گرفت مضبوط تھی مگر عدم تحفظ کا احساس بہت واضح تھا۔

ہوا کی کثافت سے وہ اندازہ لگا رہا تھا کہ یہ جگہ زیرِ زمین ہے اور کافی گہرائی میں

ہے۔ اسے یقین تھا کہ یہ جگہ ٹریننگ یونٹ کے ہیڈ کوارٹر کی عمارت کے بالکل نیچے تھی۔ جہاں وہ ٹریننگ کے لیے پہلے دن آیا تھا۔ ''کتنا عرصہ پہلے کی بات ہے۔ چند ہفتے یا چند دن!'' اسے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ ''جب اس نے پہلی مرتبہ ٹریننگ یونٹ میں رپورٹ کیا تھا تو اس کی ملاقات مسٹر ہنڈرسن سے ہوئی تھی مگر ہنڈرسن تو محض ایک سراب تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ مسٹر ہینڈرسن کو پہلے بھی مل چکا تھا۔ شاید یہ بھی کسی اہم راز کا ہی حصہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی ملاقات مسٹر ہنڈرسن سے افغانستان میں ہوئی تھی۔ کہاں۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔!''

ایڈم کا مسئلہ ابھی تک جوں کا توں تھا۔ اسے ابھی تک سرخ دروازہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ جس کے بارے میں اسے نیم غنودگی کی حالت میں ایک آواز نے مطلع کیا تھا۔ ''سرخ دروازے سے ہوشیار رہنا۔''

وہ سوچ رہا تھا کہ ''سرخ دروازہ ملنے پر اس کا ردعمل کیا ہوگا اور شاید یہی چیز اس کی زندگی کے لیے فیصلہ کن ثابت ہوگی!''

اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ ''آگ اور مٹی چار علامتوں میں سے دو علامتیں ہیں جبکہ ہوا اور پانی دیگر دو علامتیں ہیں۔ اس نے سوچا کہ سفید دروازہ یقیناً ہوا ہوگا۔ تو کیا وہ اس دروازے سے بچ کر نکل سکتا تھا!''

''آگ، ہوا، پانی۔ مٹی'' وہ سوچتا رہا کہ رنگوں کی طرح چاروں عنصری علامات کا بھی یقیناً کوئی مطلب ہے اور ان بھول بھلیوں کا خالق یقینی طور پر قدیم میتھالوجی سے باخبر معلوم ہوتا ہے۔ ایڈم نے اس سبجیکٹ کے بارے میں پڑھ رکھا تھا۔ اس لیے اس کے ذہن نے اس کی یادداشت کے بند دروازوں پر دستک دینی شروع کر دی۔ تاہم

انسانی علم کی بنیاد اور تہذیب کے اسرار اس کے لیے کلی طور پر نا قابل فہم تو نہیں تھے لیکن یہ کام اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ وہ اس دوران مسلسل بھاگتا رہا اس امید پر کہ اسے دوسرے دروازے بھی نظر آ جائیں تو وہ کسی فیصلے پر پہنچ سکے کیونکہ وہ پوری تیاری کے بغیر کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔

وہ سوچ کے گھوڑے دوڑا رہا تھا کہ ''سفید رنگ کی اگر ہوا سے مماثلت ہے تو پھر یہ جھگڑے، تضاد اور کشمکش کی نشانی ہے۔ سبز رنگ زمین سے نسبت رکھتا ہے اور اس کی مماثلت۔۔۔؟ ان چار عناصر کی ترتیب اور کیا ہے'' اس کا ذہن الجھ سا رہا تھا۔ اس نے چاروں عناصر کی ترتیب کو تاش کے پتوں سے منسلک کر کے کچھ مزید سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کے خیال میں تاش کے پتوں کی ایک قدیم تاریخ ہے جس کا آغاز قسمت کا حال بتانے والے ٹارو کارڈز سے جا کر ملتا ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ ''ٹارو کارڈز کی چار علامات کونسی ہیں۔ اگر سپیڈز کو تلوار سمجھ لیا جائے۔ لڑائی جھگڑے یا تضاد یا کشمکش کو ہوا (سفید رنگ) خیال کر لیا جائے۔ ڈائمنڈ والے کارڈز کو پینٹی کلز مان لیا جائے۔ زمین، سبز رنگ کی ہے جو کسی شخص کی پریکٹیکل فطرت کو ظاہر کرتے ہیں یعنی ڈالرز بزنس کاروبار وغیرہ وغیرہ۔''

تلوار تو پھر ملٹری یعنی فوج کا سمبل بھی ہے ان سب چیزوں پر غور وفکر کرتے کرتے اسے یہ سوچ کر قدرے مسرت کا احساس ہوا کہ اس نے سفید دروازہ نہیں کھولا وگرنہ وہ وہاں سے کب کا فرار ہو چکا ہوتا۔

تاش کے پتوں میں کلبز کا سمبل ٹارو میں وانڈز سے آیا ہے جو کہ خیالات کی نمائندگی کرتا ہے جس میں تخلیل سوچ بچار ذہنی استعداد اور ذہانت شامل ہیں یعنی اس

لفظ کے بہت سے مطلب ہو سکتے ہیں۔

آگ کا نشان ۔۔۔ اسے علم تھا کہ یہ اس کا دشمن تھا۔ اور یہی سرخ دروازہ تھا جس سے اسے ہشیار رہنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ چلتے چلتے اسے نیلے رنگ کا دروازہ دکھائی دیا۔ ایک ایسا رنگ جس کے بارے میں اس نے ابھی تک کچھ سوچ بچار ہی نہیں کی تھی۔ اس نے بائیں ہاتھ سے دروازے کے ہینڈل کو پکڑا، جبکہ دائیں ہاتھ میں پستول پر اس کی گرفت مضبوط تھی۔ اور وہ اسے چلانے کے لیے بالکل مستعد تھا۔ اس نے دروازہ پوری طرح کھول دیا مگر فائر نہیں کیا کیونکہ اس کے ذہن میں نیلے رنگ کا مطلب یکدم واضح ہو گیا۔ ارے یہ تو پانی کی نشانی ہے۔ جو کہ ٹارو کارڈز میں کپس، ہارٹس، آرٹسٹ، جذبات، محبت اور خوبصورتی کی علامت تھا۔

اس کے ساتھ وہ جیسے ہی اپنی سوچ کی گرفت سے آزاد ہوا ایڈم نے اُپنے آپ کو ایک نہایت حسین وجمیل اور نازک اندام حسینہ کے بازوؤں میں پایا۔ اس نے اپنی ساری زندگی میں اس قدر خوبصورت عورت شاید ہی دیکھی تھی۔ وہ اس کی چمکیلی زلفوں کی مسحور کن مہک سے مدہوش سا ہو رہا تھا۔ اسے خوشی تھی کہ اس نے اس عورت کو قتل نہیں کر دیا تھا۔ وہ اس کے وجود کی نرماہٹ اور گداز سے لطف اندوز ہو رہا تھا جس کی اسے اشد ضرورت تھی۔ اسے یوں مدہوش دیکھ کر عورت نے کہا کہ ''تمہیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ تمہیں ابھی ایک اور دروازہ تلاش کرنا ہے۔'' ایڈم نے عورت سے پوچھا ''کیا تم ایجنٹ ہو'' عورت نے پلکیں جھپکتے ہوئے کہا ''ہم تمہارے مخالف نہیں ہیں بلکہ تمہارے حلیف ہیں۔''

''شاید یہ ان تمام لوگوں میں سے ایک ہے جو اس سے خفیہ راز جاننے کی کوشش

کرر ہے ہیں۔'' یہ سوچ کر ایڈم نے خود کو جلدی سے اس عورت سے الگ کیا۔ عورت تحکمانہ انداز میں بولی کہ ''سوچو۔ اپنے ذہن پر زور دو کہ تم کیا جانتے ہو اور تم کچھ تو جانتے ہو۔''

ایڈم نے جواب دیا ''ہاں میں جانتا ہوں سرخ دروازہ'' یہ کہہ کر وہ راہداری کی طرف بھاگا۔ جس سرخ دروازے کے بارے میں اسے خبردار کیا گیا تھا وہ اس کے سامنے آگ کے ایک گولے کی مانند چمک رہا تھا جو کبھی سرخ تو کبھی نارنجی رنگ میں تبدیل ہو جاتا۔ اس نے اپنے خیالات کو مجتمع کیا تو اسے ایسا لگا کہ جو آواز اس نے سنی تھی وہ یونٹ کے اندر سے نہیں آ رہی تھی بلکہ وہ اس کے اپنے ذہن میں ابھری تھی۔ اس نے سوچا اس کا ضمیر نہیں۔۔۔ آواز باہر سے آئی تھی جو اسے بچانا چاہتی تھی۔'' اس کے ساتھ ہی اس کی یادداشت پر چھائے ہوئے گہرے بادل چھٹ گئے۔ اسے یاد آیا کہ ہنڈرسن افغانستان میں ظلم و تشدد روا رکھنے والے مرکز میں انٹیلی جنس آفیسر تھا۔ بہت سی اموات، بُری طرح جھلسے ہوئے مردہ جسم، کئی دل خراش مناظر اس کی نگاہوں میں گھوم گئے۔ اب تک وہ ان مناظر کو یاد کرنے سے احتراز کرتا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ''کیا اس نے وہ سب کچھ دیکھا تھا یا اس کا وہم تھا کیا وہ وہاں پر موجود تھا۔ یا نہیں تھا۔ مگر وہ تو اس علاقے میں موجود تھا۔ ہاں اس نے سب دیکھا تھا۔۔۔!''

اب سرخ دروازہ۔۔۔ اب وہ وقت آن پہنچا تھا جس کا وہ کافی دیر سے منتظر تھا۔ ایک نہایت زیرک صورتِ حال پیدا ہو چکی تھی۔ جس طرح کہ قرونِ وسطیٰ کے عہد میں ایک گنہگار اور مجرم کے درمیان فیصلے کی گھڑی آن پہنچی ہو۔

ایڈم نے زور سے دھکا دے کر جیسے ہی سرخ دروازہ کھولا۔ ہنڈرسن وہاں پہلے

سے موجود تھا۔ دونوں کے پستول سے بیک وقت گولیاں نکلیں۔ ہنڈرسن کی گولی ایڈم کے بازو کی کھال کو چیرتی ہوئی نکل گئی جبکہ ایڈم کا نشانہ بہتر تھا اور اس کے پستول کی گولی سیدھی ہنڈرسن کی پیشانی پر دونوں آنکھوں کے درمیان پیوست ہو کر اس کے ماتھے پر ایک سرخ نشان چھوڑ گئی، جس طرح ہندو عورتیں اپنے ماتھے پر تلک لگاتی ہیں۔

''دشمن مر چکا تھا...... سرخ دروازہ تسخیر ہو چکا تھا۔''

عورت نے متجسس نگاہوں سے ایڈم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ''کیا تمہیں افغانستان میں ہونے والے ظلم وتشدد کے واقعے کا علم تھا۔'' ایڈم نے اسے پیار سے بوسہ دیتے ہوئے جواب دیا ''ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس دن کیا ہوا تھا۔۔۔!''



تھرڈ ورلڈ گرل
(The Third World Girl)

عائشہ کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا جہاں زندگی ابھی تک رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ مذہب، تہذیب اور روایت کے نام پر اگر کوئی نشانے کی زد پر تھا تو صرف عورتیں۔۔۔۔۔! عائشہ زندگی سے بھرپور لڑکی تھی۔ کھل کر ہنسنا، مسکرانا بلکہ جی بھر کر قہقہے لگانا چاہتی تھی۔ وہ آسمان کی وسعتوں میں گم ہو جانا چاہتی تھی۔ اس کا دل چاہتا کہ اس کے پر نکل آئیں تو وہ اڑتی کوہ قاف میں جا نکلے۔ مگر۔۔۔۔ گھر کے گھٹن زدہ ماحول میں اس کی بے سروپا باتوں پر ماں اکثر اسے برا بھلا کہتی اور یہ مت کرو۔ وہ مت کرو کی رٹ لگائے رکھتی۔ عائشہ بے حد ذہین تھی۔ ہر امتحان امتیازی پوزیشن سے پاس کیا۔ کبھی تو اس کا دل چاہتا کہ وہ پائلٹ بن جائے اور کبھی وہ جرنلزم کی طرف متوجہ ہو جاتی مگر گھر میں اس کے کیرئیر ایسپیریشن کو کسی نے درخور اعتنا نہیں سمجھا۔

وہ چار بہنوں میں تیسرے نمبر پر تھی۔ والد ایک سرکاری دفتر میں معقول مشاہرے پر ملازم تھے مگر مہنگائی کے اس دور میں تنخواہ ملنے سے قبل ہی اخراجات کی ایک طویل فہرست تیار ہوتی۔ زندگی کو زندگی کرتے کرتے صبح سے شام ہو جاتی مگر کسی

بات کا کوئی سرا ڈھنگ سے ہاتھ نہ آتا۔

عائشہ کی والدہ کو اگر سب سے زیادہ کسی کی فکر تھی تو صرف عائشہ کی، انہیں کبھی کبھی تو اس کی باتوں سے سخت وحشت ہونے لگتی کہ خدا جانے یہ لڑکی کیا گل کھلائے گی۔۔۔؟"

یہ عائشہ کی خوش قسمتی تھی کہ گریجویشن کرتے ہی ایک خوشحال گھرانے سے اس کے لیے شادی کا پیغام آ گیا۔ عدنان اس کی سہیلی کا کزن تھا اور عائشہ کو کسی خاندانی تقریب میں دیکھ کر اس کی شوخ وشنگ شخصیت کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والی بات ہو گئی۔ عائشہ تو بغیر پروں کے ہی اڑ رہی تھی۔ عائشہ کا قدم عدنان کے لیے بہت سعد ثابت ہوا اور شادی کے چند ہی ماہ بعد کمپنی نے اس کی پوسٹنگ لندن میں کر دی۔ عائشہ کو تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ خوابوں کی تعبیر کبھی اتنی جلدی بھی مل جاتی ہے۔۔۔"اے کاش کچھ اور خواب دیکھ لیتی تو سب ایک ساتھ ہی پورے ہو جاتے۔۔۔"وہ اکثر سوچتی!

عائشہ کو لندن آئے تقریباً سات برس ہونے کو آئے تھے۔ پہلا سال تو دونوں نے سیر سپاٹے کرنے میں ہی گزار دیا۔ جی بھر کر لندن دیکھا۔ برٹش میوزیم، میڈم تساؤ، ٹرافلگ اسکوائر، پکاڈلی، کاونٹ گارڈنز، دریائے ٹیمز، بگ بین۔ بکنگم پیلس، ہائیڈ پارک، ہاؤسز آف پارلیمنٹ، آکسفورڈ سٹریٹ، ہیرڈز، ہر وہ جگہ جس کے بارے میں کہیں بھی سن اور پڑھ رکھا تھا۔ عائشہ نے دریافت کر ڈالی۔

طویل ہنی مون کا اختتام ہوا تو اگلے چند سالوں میں دو گول مٹول بچوں نے اس کا سارا وقت اپنے نام لکھوا لیا۔ عدنان اکثر بزنس ٹورز پر رہتے کبھی یورپ کبھی مڈل

ایسٹ تو کبھی فار ایسٹ۔۔۔۔ایسے میں عائشہ دو شرارتی سے بچوں کی دیکھ ریکھ کرتے ادھ موئی سی ہو جاتی۔ نہ کوئی عزیز نہ رشتہ دار۔۔۔کسی سے ڈھنگ سے میل جول بھی نہ بڑھا کیونکہ صرف چند ہی ایشیائی گھرانے ان کے علاقے میں تھے۔ زیادہ تر تو انگریز لوگ تھے۔ کتنا ارمان تھا کہ لندن جا کر کچھ مزید پڑھے گی اور جب وہاں سے ڈھیر ساری ڈگریاں سمیٹ کر واپس پاکستان آئے گی تو سب بہنوں اور سہیلیوں کو کیسی جلن ہو گی۔۔۔مگر سب خواب آہستہ آہستہ ہوا میں تحلیل ہوتے جا رہے تھے۔ عدنان سے شکایت بے کار تھی کیونکہ وہ تو دن رات کولہو کے بیل کی طرح اپنے کام میں ہی مصروف رہتا۔ یہ سب سوچ سوچ کر عائشہ پر ایک پژمردگی سی طاری ہوتی جا رہی تھی۔۔۔۔!

کتابوں سے اسے شروع ہی سے عشق تھا۔ یہاں بھی ہر ہفتے مقامی لائبریری میں جا کر کم از کم ایک درجن کتابیں ایشو کروا کر گھر لے آتی جنہیں پڑھنے کا وقت اسے کم ہی ملتا۔ اکثر و بیشتر کتابیں اسے پڑھے بغیر ہی جرمانے کی رقم دے کر لوٹانی پڑتیں۔ ایسے میں اسے اپنے آپ پر بہت غصہ آتا کہ کہاں تو وہ کتابی کیڑا تھی مجال ہے کہ کوئی اخبار کا تراشہ بھی اس کی نظر بچا کر نکل جائے مگر اب۔۔۔۔!

جب وہ کتابیں واپس کرنے لائبریری جاتی تو شرمندہ سی کاؤنٹر پر کھڑی رہتی۔ جیسے ریسپشن پر کھڑی انگریز لڑکی کو پتہ چل گیا ہو کہ اس نے ان میں سے کوئی کتاب بھی نہیں پڑھی تھی۔

آج انہی سوچوں میں گم جیسے ہی وہ لائبریری کے ریسپشن ہال میں داخل ہوئی تو ایک بڑے سے رنگین پوسٹر کو دیکھ کر چونک سی گئی۔

"Speaking Poetry Session" کیا مطلب ہے اس کا؟'' تو کیا کوئی

گونگی پوئٹری بھی ہوتی ہے۔''مارے تجسس کے اس نے اندر آتے ہی کاؤنٹر پر کھڑی انگریز لڑکی سے ایک ساتھ ہی کئی سوال کر ڈالے تو وہ اطمینان سے بولی کہ ''دراصل ان کی لائبریری پوئٹری کی پروموشن کے لیے نامزد ہوئی ہے۔اب یہاں اکثر و بیشتر نامور شعرا اپنا کلام پیش کیا کریں گے۔''

اس نے اگلا سوال داغ دیا، کیا صرف انگلش پوئٹری ہی ہوگی یا ملٹی لینگول شاعری بھی سننے کو ملے گی''۔ابھی تو میرے خیال میں انگلش پوئٹری سیشن ہی ہوں گے۔بعد میں کچھ سلسلہ بن جائے تو الگ بات ہے مگر فی الحال کچھ کہنا مشکل ہے۔''لڑکی نے شائستگی سے جواب دیا عائشہ کا تجسس ابھی تک برقرار تھا۔''یہ سپیکنگ پوئٹری کیا ہوتی ہے؟''اس نے بے تابی سے سوال کیا۔''ایک بہت مشہور سیاہ فام شاعرہ ہے جو یہاں اپنی پوئٹری پریذنٹ کرنے آرہی ہے۔وہ اتنے زبردست ڈرامائی انداز میں اپنا کلام پیش کرتی ہے۔لگتا ہے کہ ہال کے در و دیوار تک اس کے ساتھ ہر مصرعہ دہرا رہے ہوں۔''لڑکی نے جواب دیا۔شاعرہ کی اتنی زبردست قسم کی تعریف سن کر عائشہ نے پکا ارادہ کرلیا کہ وہ ضرور سپیکنگ پوئٹری سیشن اٹینڈ کرے گی۔انگریز لڑکی نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنی سیٹ پیشگی ریزرو کروالے کیونکہ ممکن ہے کہ اس دن ہال میں کھڑے ہونے کو بھی جگہ نہ ملے۔عائشہ اپنی سیٹ ریزرو کروا کر بڑے فاتحانہ انداز میں لائبریری سے باہر نکلی جیسے لائبریری کی کتابیں ڈھنگ سے نہ پڑھنے کی اس نے آج تلافی کردی ہو۔۔۔اسے لگ رہا تھا جیسے وہ تاریک سے روشنی میں آ گئی ہو۔

پوئٹری سیشن پر جانے کی تیاری اس نے ہفتہ بھر پہلے ہی شروع کردی۔بچوں کے لیے بے بی سسٹر کا انتظام کیا۔اس روز صبح ہی صبح اٹھ کر تمام کام نپٹائے اپنے لیے

سینڈوچ بنائے۔ فلاسک میں کافی ڈالی۔ ساتھ میں کولڈ ڈرنکس بھی رکھ لیے۔ گویا آج اس کا پوئٹری انجوائے کرنے کا زبردست پروگرام تھا۔

دو بجنے میں ابھی کافی وقت تھا کہ وہ لائبریری چلی گئی تا کہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر تقریب سے اچھی طرح لطف اندوز ہو سکے۔ ابھی صرف چند ہی لوگ ہال میں آئے تھے۔ آہستہ آہستہ ہال بھرنا شروع ہو گیا۔ عائشہ سوچ رہی تھی کہ ہال کی آرائش کتنی سادہ سی ہے۔ بس دیوار پر شاعرہ کے نام کا ایک بینر۔ نہ اسٹیج پر میز نہ کرسیاں۔ بس ایک چھوٹی سی تپائی اور مائیک۔ پانی کا جگ اور گلاس، یہی کل کائنات تھی۔ اور اردو شاعری میں کیا طمطراق۔ رونمائیاں، صدارتیں، مہمانان خصوصی، تقدیم و تاخیر اور نظامت کے جھگڑے، داد دینے اور نہ دینے کی پالیٹکس، کھانوں کی زبردست مہک۔ جیسے کسی شادی کی تقریب میں آئے ہوں۔۔۔ اور یہاں۔۔ کیسی بے رونقی ہے جیسے شاعرہ کے سوئم پر آئے ہوں۔۔۔!

ٹھیک دو بجے منتظمین نے مائیک پر آ کر حاضرین کو ویلکم کہا اور شاعرہ کا مختصر سا تعارف کروایا۔ اس کے ساتھ ہی ہال کی روشنیاں قدرے مدھم ہو گئیں۔ ماحول کچھ خوابناک سا ہو گیا تھا۔ اچانک اسے اسٹیج کی ایک جانب سے آہستہ آگے بڑھتی ہوئی ایک شبیہ سی نظر آئی ابھی وہ اندھیرے میں اسٹیج پر نظر آنے والے ہیولے کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہی تھی کہ اچانک سٹیج سے ایک زوردار نعرہ بلند ہوا۔ عائشہ اس اچانک حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھی اور کرسی سے تقریباً گرتے گرتے بچی۔ ہال میں باقی حاضرین کی بھی کم و بیش یہی کیفیت تھی اتنے میں اسٹیج کی روشنیاں ذرا تیز ہو گئیں اور بیک گراؤنڈ میں ہلکا ہلکا سا میوزک شروع ہو گیا۔

شاعرہ کی شبیہ اب واضح ہو چکی تھی یہ ادھیڑ عمر کی دبلی پتلی سیاہ فام عورت تھی۔ بغیر کسی تمہید کے اس نے آتے ہی نہایت ڈرامائی انداز میں پوئٹری پیش کرنی شروع کر دی۔ اس کا جوش وجذبہ دیدنی تھی۔ جیسے اس پر شاعری نازل ہو رہی ہو۔ ایک کے بعد ایک نظم۔ ہاتھ ہلاتی۔ سٹیج پر گھوم گھوم کر بل کھاتی شاعرہ کی سیاہ رنگت جوش خطابت سے اور چمک رہی تھی اوپر سے میوزک کا زیر و بم، پوئٹری واقعی بول رہی تھی۔ ہر نظم کے اختتام پر حاضرین بھرپور تالیاں بجا کر اسے داد دے رہے تھے۔ ہال میں ایک مسحور کن ماحول تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔

اب شاعرہ نے اپنی آخری نظم ''تھرڈ ورلڈ گرل'' یعنی تیسری دنیا کی لڑکی سنانی شروع کی۔ بہت پاورفل نظم تھی۔ ہال میں مکمل سناٹا چھا گیا ایک کے بعد ایک مصرعہ۔ سوچ پر تازیانے کا کام کر رہا تھا۔

''میں تیسری دنیا کی لڑکی
اک ناتراشیدہ ہیرا
اک نادریافت موتی
میرے عہد سے بہت پہلے
مجھے میرے خواب سے جگا دیا گیا
میرے اندر۔۔۔ کئی ان کہی کہانیاں مچل رہی ہیں
میں جوان۔ ناجہاندیدہ۔۔۔
مگر پیدائش سے پہلے ہی عمر رسیدہ!''

''میں تیسری دنیا کی لڑکی۔۔۔'' یہ مصرعہ وہ بار بار دہرا رہی تھی۔

شاعرہ پورے اسٹیج پر لٹو کی طرح مقناطیسی انداز میں چکر لگا رہی تھی۔ لامتناہی دکھ۔ تکلیف اور درد اس کے انگ انگ سے چھلک رہا تھا۔ تیسری دنیا کی لڑکی کی سسکیاں صاف سنائی دے رہی تھی۔ زبردست ہیجانی کیفیت میں مبتلا۔ بے کل، مضطرب۔ بے چین جیسے بھٹکی ہوئی روح۔۔۔۔ جیسے بارش کا قطرہ سیپ میں بند ہو کر موتی میں تبدیل ہو رہا ہو۔۔۔ کوئلہ ہیرا بننے کے عمل سے گزر رہا ہو۔۔۔ جیسے تخلیق کے کرب سے دوچار۔۔۔۔ دردزہ میں مبتلا۔۔۔ وہ بچہ جننے کے آخری مرحلے تک آ پہنچی ہو۔

اسی جوش و جذبے اور ہیجان میں سیاہ فام شاعرہ اسٹیج کے کنارے کے بے حد قریب آ چکی تھی۔ چشم زدن میں وہ دھڑام سے اسٹیج سے نیچے تاریکی میں جا گری۔ سپیکنگ پوئٹری یک لخت خاموش ہو گئی۔ سب ہیرے موتی بکھر گئے۔ کہانی ادھوری رہ گئی۔ تیسری دنیا کی لڑکی پھر تاریکی میں جا گری تھی۔

''کیا تھرڈ ورلڈ گرل کبھی اندھیروں سے باہر نکل سکے گی؟ عائشہ یہ سوچتی ہوئی۔ آنسو پونچھ کر ہال سے باہر نکل آئی۔



ائیر فریشنز
(Air Freshner)

زوبی کو انگلینڈ آتے ہی جن چند چیزوں سے عشق ہوا تھا ان میں فش اینڈ چپس، باؤنٹی چاکلیٹ، سالٹ اینڈ وینگر کریسپ، ڈائی جیسٹو بسکٹ، بگ بین اور ائیر فریشنز تھے۔ رنگ برنگی ائیر فریشنز کو جمع کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ ہوا ذرا کثیف ہوئی۔ کوئی ناپسندیدہ ناخوشگوار بو ناک کی مہمان بننا چاہتی تو زوبی جھٹ ائیر فریشنز نکال کر لے آتی۔ سب ہی زوبی کے اس کریز سے واقف تھے اور اسے دیوانوں کی طرح ائیر فریشنز چھڑکتے دیکھ کر صرف زیرِ لب مسکرا کر رہ جاتے تھے۔

پاکستان سے گریجویشن کر کے جب وہ انگلینڈ آئی تو اسے سخت مایوسی ہوئی کیونکہ جس ولایت کے دیو مالائی قصے کہانیاں وہ بچپن سے سنتی آئی تھی یہاں تو ویسا کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ دودھ اور شہد کی نہریں تھیں۔ نہ درختوں پر پتوں کی جگہ پاؤنڈز۔۔۔ نہ ہی سڑکیں اتنی صاف شفاف تھیں کہ آئینہ دیکھنے کی نوبت نہ آئے۔ بلکہ جس زمانے میں زوبی انگلینڈ آئی اس وقت تو یہاں بجلی کا بحران چل رہا تھا۔ سڑکوں پر روشنیاں کم کم ہی تھیں۔ اور جو نظر آتیں وہ بھی زرد زرد سی۔ جیسے باقی ماندہ روشنیوں سے بچھڑ کر اداس ہو گئی ہوں۔ بے سورج موسم۔ گھرے گھرے بادل دیکھ کر تو وہ گھبرا سی گئی۔ یا

خدایا۔۔۔یہ کیسا ملک ہے۔نہ دن کی خبر نہ رات کا پتہ، بے رنگ سی گوری چمڑیاں۔
جن کی خوبصورتی کے قصے عظیم ماموں سناتے نہ تھکتے تھے جیسے پرستان کی پریاں راستہ
بھول کر انگلینڈ میں آ اتری ہوں۔انگلینڈ کا یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر تو زوبی اداس سی ہو
گئی جتنے جوش وخروش سے دوستوں کو الوداع کہتے ہوئے جہاز کی سیڑھیاں چڑھی تھی
لگتا انگلینڈ میں آ کر پاتال میں جا گری ہو۔۔۔یعنی مکمل کلچر شاک۔

انگریزی زبان وادب سے اسے ہمیشہ سے ہی دلچسپی رہی تھی۔انگریزی کے
ہر امتحان میں امتیازی پوزیشن حاصل کرتی۔لگتا تھا انگلینڈ میں تو انگریزی کا کوئی مسئلہ
ہی نہیں ہوگا۔گھر کی مرغی جب چاہے حلال کر ڈالیں۔مگر یہاں آ کر پتہ چلا کہ
پاکستان میں کلاس روم میں پڑھائی جانے والی انگریزی۔کتابوں میں چاہے ویسی ہی
ہو۔لکھنے لکھانے میں بھی ویسی ہی ہو۔مگر لب ولہجہ الگ ہے اور اسے سمجھنے کے لیے اس
کلچر میں رہنا پڑے گا۔مقامی لوگوں سے گھلنا ملنا اور بات چیت کرنا ہوگی کیونکہ زبان
ایک زندہ چیز ہے۔یعنی Language is a living thing۔

جب کبھی اس نے کارنر شاپ کی انگریز عورت سے بات کرنے کی کوشش کی۔
اس کا لب ولہجہ زوبی کے سر کے اوپر سے گزر جاتا اور وہ مروت میں مسکراتی ہوئی دکان
سے باہر آ جاتی۔چھوٹے بھائی جو انگلینڈ کافی عرصہ پہلے آ گئے تھے یہاں کے سکولوں
اور کالجوں میں پڑھ رہے تھے۔ان سے انگریزی لب ولہجہ سمجھنے کی کوشش کرتی تو وہ اس
کا مذاق اڑاتے۔درمیان والا بھائی تو اس کی ٹانگ ضرور کھینچتا۔غصے میں وہ اسے شٹ
اپ کہہ کر بیڈروم میں جا گھستی۔ایک دن بڑے بھیا نے اسے سنجیدگی سے مشورہ دیا کہ
”یوں گھر میں پڑے رہنے اور جلنے کڑھنے سے کچھ نہیں ہونے والا۔بہتر ہے کہ باہر

نکلو اور مقامی ایڈلٹ ایجوکیشن سنٹر میں پارٹ ٹائم انگریزی بول چال کی کلاسز جوائن کر لو پڑھی لکھی ہو دنوں میں ہی رواں ہو جاؤ گی تو پھر نوکری ڈھونڈنے میں بھی مشکل نہ رہے گی کام مل گیا تو یہاں دل بھی لگ جائے گا۔ ویسے کوشش کرو کہ زیادہ سے زیادہ باہر جا کر مقامی لوگوں سے انگریزی میں بات چیت کرو۔ کچھ تو پلے پڑے گا۔"

بھیا کا مشورہ اسے اچھا لگا اب روزانہ دو گھنٹے وہ لینگویج ٹرپ پر نکل جاتی۔ اور چند ہفتوں میں ہی اسے محسوس ہونا شروع ہو گیا کہ اسے مقامی ایکسنٹ کچھ کچھ سمجھ آنا شروع ہو گیا ہے۔

ایوَنگ کلاسز میں ایک ہی ٹرم کے بعد وہ کافی حد تک انگریزی کے مقامی لب و لہجہ کو سمجھنے لگ گئی تھی۔ اگلی ٹرم کے لیے اس نے کالج میں ایڈمیشن لے لیا۔ وہاں پر انگلش لیکچرار کی ساری بات اس کو سمجھ آ رہی تھی۔ وہ شش و پنج میں تھی کہ آخر باہر سڑکوں بازاروں، دکانوں میں گھومنے پھرنے اور عام لوگوں کی انگریزی سمجھنے میں اسے کیوں دشواری ہو رہی تھی تو بھیا نے بتایا کہ "جن لوگوں سے تم انگریزی سیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں وہ تو بیچارے ہمارے ہاں کے نیم خواندہ لوگوں جیسے ہی ہیں وہ کونسا کوینز انگلش بولیں گے کہ تمہاری سمجھ میں سو فیصد بات آ جائے۔ تم پڑھی لکھی ہو تو پڑھے لکھے لوگوں کی انگریزی تمہیں سمجھ آ جائے گی کیونکہ اکیڈیمیا کی انگریزی پر مقامی لب و لہجہ کا رنگ نہیں چڑھا ہوتا۔" بھیا کی بات سن کر میری جان میں جان آئی وگرنہ تو لگ رہا تھا سب پڑھا لکھا اکارت گیا۔ سوچ رہی تھی میں نالائق ہوں یا مجھے پڑھانے والے۔ مگر دونوں ہی باتیں غلط تھیں۔ کالج میں دو ہی ٹرم گزار کر زوبی کو انگریزی بولنے اور سمجھنے پر کافی عبور ہو گیا تھا۔

ایک دن بھیا نے مشورہ دیا کہ ''تم جاب سینٹر میں جا کر اپنا نام رجسٹر کروالو تا کہ کوئی مناسب جاب کی تلاش کی جا سکے۔'' بھیا کے ساتھ بڑے فخر سے جا کر زوبی جاب سینٹر میں رجسٹر ہوگئی۔ ہر ہفتے وہاں جا کر حاضری لگانا پڑتی اور اس اقرار نامے پر دستخط کرنا پڑتے کہ ''میں ملازمت کرنا چاہتی ہوں۔ بالکل تندرست ہوں۔ اور پوری دیانتداری سے ملازمت تلاش کر رہی ہوں۔'' اس کے بدلے میں بیس پونڈ کا چیک ہر ہفتے بذریعہ ڈاک موصول ہو جاتا۔

روز روز جاب سینٹر کے چکر لگاتے لگاتے زوبی کچھ بور سی ہوگئی۔ ایک دن سینٹر والوں نے اسے پیکنگ کی جاب کے لیے ایک ویئر ہاؤس میں بھیجا۔ بلکہ وہ جگہ کافی دور تھی۔ راستہ پوچھتی پوچھتی وہ آخر وہاں پہنچ ہی گئی۔ ویئر ہاؤس میں کچھ نوجوان انگریز لڑکے لڑکیاں پیکنگ کے کام میں مصروف تھے اسے کن اکھیوں سے دیکھ کر کھی کھی کرنے لگ گئے۔ ان کے رویے سے اسے بڑی کوفت ہوئی۔ خیر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق ان سے منیجر کے بارے میں پوچھا کہ وہ انٹرویو کے لیے آئی ہے۔ اسے لگا جیسے جواب میں ایک انگریز لڑکے نے اسے ''پاکی'' کہا ہو۔ جسے سن کر اسے بہت غصہ آیا۔ اس نے ان سے منہ ماری شروع کر دی۔ اتنے میں ویئر ہاؤس کا منیجر آن پہنچا۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے ایک لڑکے سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ تو لڑکے کی بجائے زوبی نے غصے سے جواب دیا کہ ''میں پیکنگ کی جاب کے لیے جاب سینٹر کی طرف سے انٹرویو کے لیے آئی ہوں مگر انہوں نے مجھے پاکی کہا ہے۔'' انگریز لڑکے نے کہا کہ ''نہیں انہوں نے پیکر کہا تھا۔'' بس اس بات پر تکرار ہوگئی۔ ویئر ہاؤس منیجر واضح طور پر اپنے ملازمین کا دفاع کر رہا تھا۔ اس کا موقف تھا کہ زوبی کو ان کی بات سمجھنے میں

غلطی لگی تھی۔ انہوں نے پا کی نہیں بلکہ پیکر کہا تھا۔ زوبی کو پتہ تھا کہ لڑکے سراسر جھوٹ بول رہے تھے اور دونوں لفظ خلط ملط کر کے فائدہ اٹھانا چاہ رہے تھے۔ زوبی گٹ لوسٹ کہہ کر جاب پر لعنت بھیجتی ہوئی وہاں سے آ گئی۔ اور ساتھ ہی پکا ارادہ کر لیا کہ اب وہ اس قسم کی جگہوں پر نوکری کے لیے نہیں جائے گی بلکہ بہتر قسم کے پڑھے لکھے لوگوں کے ماحول میں جاب کرے گی۔ ''ایسی جگہیں تو بالکل بھی اس کے کام کرنے کے لائق نہ تھیں۔ فضول سا ماحول، فقرے بازی، جسم کو چیرتی نگاہیں، گندی ذہنیت۔۔۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل آئی۔

زوبی اگلے ہفتے پھر جاب سینٹر جا دھمکی اور اب کی بار جاب سینٹر کی ایڈوائز سے شکایت بھی کی کہ اسے اس قسم کی جگہوں پر انٹرویو کے لیے مت بھیجا جائے۔ جہاں لوگوں کے رویے اس قدر غلط ہوں۔ اس کی بات سن کر جاب سینٹر ایڈوائزر اسے کچھ بے یقینی کی سی کیفیت سے گھورنے لگی۔۔۔! انگریز عورت نے اس کی بات کا تو کوئی جواب نہیں دیا مگر اسے ایک مشہور ڈیپارٹمنٹل سٹور میں سیلز گرل کی نوکری کے لیے انٹرویو لیٹر بنا کر دے دیا۔ دوسرے روز وہ انٹرویو کے لیے گئی تو چند اور انگریز لڑکے لڑکیاں انٹرویو کے لیے لابی میں منتظر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ان پر اچٹتی سی نگاہ ڈال کر آگے بڑھ گئی۔ ابھی وہ ادھر ادھر کا جائزہ لے رہی تھی کہ اس کا نام پکارا گیا۔ ''شاید وہ انٹرویو کے لیے پہلی امیدوار تھی'' اسنے سوچا جیسے ہی وہ چہرے پہ مسکراہٹ سجائے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی انٹرویو لینے والی انگریز عورت نے کمرے میں ائیر فریشنر سپرے کرنا شروع کر دیا۔ زوبی سراسیمگی کی حالت میں کرسی کے سرے پر ہی ٹک گئی۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ جیسے وہاں سے ابھی اٹھ کر

بھاگ جائے گی۔ دماغ جیٹ کی رفتار سے بھاگ رہا تھا۔۔۔ وہ کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر ائیر فریشنر تو بوجھل گندی، کثیف ہوا کو صاف کرنے کے لیے سپرے کیا جاتا ہے۔ اس انگریز عورت نے ائیر فریشنر کیوں سپرے کیا؟ کیا میرے کمرے میں آنے سے۔۔۔؟ اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکی۔۔۔ اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔

چند رسمی سی باتیں پوچھنے کے بعد انگریز عورت نے اسے پچیس پونڈ ہفتہ پر ملازمت کی پیش کش کر دی مگر زوبی اس کی ائیر فریشنر والی حرکت سے سخت غصے میں تھی کیونکہ "It was Shear insult" سراسر بے عزتی۔۔۔ مکمل توہین! ایسی اہانت۔۔۔!

زوبی نے سختی سے ملازمت کی پیشکش ٹھکراتے ہوئے کہا۔ ''بیس پونڈ تو مجھے جاب سینٹر والے بغیر کام کے ہر ہفتے گھر بھیج دیتے ہیں۔ کیا میں صرف پانچ پونڈ کے لیے تمہارے یہاں کام کروں گی؟''

انگریز عورت زوبی کے دلیرانہ جواب پر حیران سی رہ گئی۔ زوبی اسے اسی حالت میں چھوڑ کر دھڑام سے دروازہ بند کر کے کمرے سے باہر آ گئی۔ اسے یوں لگا جیسے جاب اس کے منہ پر مار کر اس نے تمام نسل پرستوں سے اپنی توہین کا بدلہ لے لیا ہو۔

گھر آنے کے بعد زوبی نے سارے ائیر فریشنر ڈسٹ بن۔۔۔۔!

○

آنرکلنگ

(Honour Killing)

مولوی امیر الدین کا پارہ ہمیشہ کی طرح آج بھی ساتویں آسمان پر تھا۔گرجتے برستے مولوی کا ہوائی فائر کرنے میں تو کوئی ثانی ہی نہیں تھا۔حالانکہ سیّدانی بھی بڑی دل گردے والی عورت تھی۔ زبان کی کافی تیز۔ کرنے پر آتی تو ذرا لحاظ نہ کرتی مگر جب مولوی امیر الدین فائر کھولتے تو سیّدانی سیز فائر کر دیتی۔ زندگی کی گاڑی بس یونہی چھک چھک کرتی ہوتی چلی جارہی تھی۔ کسی اسٹیشن پر ذرا زیادہ دیر رکُ جاتی اور جب تک سبز جھنڈی ہلتی نظر نہ آتی زمین وآسمان سانس روکے رکھتے۔

مگر آج تو حد ہی ہوگئی تھی مولوی امیر الدین کورہ رہ کر غصے کے دورے پڑرہے تھے۔سب بچے اپنے اپنے کمروں میں دبکے بیٹھے تھے بس تیروں کی بوچھاڑ سہنے کے لیے سیّدانی میدان میں ڈٹی ہوئی تھی بات کچھ بھی نہ تھی بڑی بیٹی شرمین نے کالج میں داخلے کی ضد کرڈالی تھی مولوی امیر الدین کو یوں لگا جیسے اس نے باپ دادا کی عزت پر کالک پوت دی ہو۔ بیٹی بھی دھن کی پکی تھی۔ایک ہی رٹ تھی کہ ”آخروہ کب تک گھر میں بیکار بیٹھی رہے گی۔ نہ آگے پڑھنے کی آزادی۔۔۔ نہ ہی کوئی ملازمت کرنے کا ماحول۔۔۔ایسے میں کوئی کرے تو کیا کرے؟ انگلینڈ میں رہتے ہوئے بھی

اس قدر دقیانوسی ماحول۔۔۔؟'' شرمین اکثر بڑبڑاتی۔۔۔! مولوی امیر الدین بیوی اور بیٹیوں کو تو تہہ خانے میں چھپا کر رکھتا مگر محلے بھر کی نئی نئی جوان ہوتی ہوئی شوخ و شنگ لڑکیوں کو کن اکھیوں سے دیکھنا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتا تھا۔ مولوی کے اسی دوغلے پن سے اس کی بیٹی شرمین کو چڑ تھی کہ ''خود میاں فصیحت اور دوسروں کو نصیحت۔۔۔!'' مولوی کی دو بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ شرمین اور ریان جڑواں بہن بھائی تھے اس کے بعد نرمہ اور کامران۔۔۔ بچے ماں باپ کے درمیان ہونے والی سرحدی جھڑپوں میں ملوث نہ ہوتے وگرنہ ماں کی طرفداری کرنے کی پاداش میں ان کی شامت آجاتی۔

سیدانی محلے بھر کی بچیوں کو قرآن پاک پڑھا کر ثوابِ دارین حاصل کرتیں۔ بسم اللہ۔ آمین۔۔۔ عقیقے۔۔۔ میلاد۔۔۔ گیارہویں۔۔۔ نذر نیاز۔۔۔ نذرانے بس ایک شور سا مچا رہتا۔ چند ایک عورتیں ہمیشہ سیّدانی کے پاس دعا کروانے کی غرض سے موجود رہتیں۔ ہر جمعرات کو خاص دعا کا اہتمام کیا جاتا۔ درود سلام کی محفل منعقد ہوتی۔ جو مولوی امیر الدین کے گھر لوٹ آنے سے پہلے ہی ختم کر دی جاتی۔

اگر کبھی عورتوں کو اٹھنے میں دیر ہو جاتی اور مولوی امیر الدین گھر لوٹ آتا تو اس کے قدموں کی چاپ سن کر سبھی عورتیں دوپٹے، چادریں دوبارہ سے درست کرنے لگ جاتیں۔ سیّدانی ہاتھ کے اشارے سے انہیں خاموش رہنے کو کہتی کہ ''مولوی امیر الدین راہداری سے گزر جائیں تو وہ پھر نکلیں۔'' گویا ایک ہنستا بستا گھر نہ ہوا بیگار کیمپ ہو گیا۔ جہاں ہر وقت کسی انہونی کا دھڑ کا لگا رہتا۔

مولوی کی بڑی بیٹی شرمین زندگی سے بھرپور لڑکی تھی۔ جی بھر کر جینا چاہتی تھی۔

ہنسنا۔کھیلنا۔کودنا چاہتی تھی مگر گھر کا ماحول یوں تھا جیسے شہر خموشاں۔ایسے میں تنہائی سے گھبرا کر وہ کسی نہ کسی سہیلی کو گھر پر بلاتی کیونکہ اسے کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔

چھوٹی بیٹی فرمین اللہ میاں کی گائے تھی۔سکول ختم کرتے ہی گھر کی زیادہ تر ذمہ داری اس کے کندھوں پہ ڈال دی گئی تھی۔کیونکہ اس کے اندر ایک فطری رکھ رکھاؤ اور سلیقہ تھا جو کہ شرمین میں قدرے کم تھا۔اس کی نٹ کھٹ طبیعت اسے کبھی سنجیدہ ہونے کا موقعہ ہی نہ دیتی۔جبکہ فرمین بہت کم ہنستی اور بولتی۔۔۔اس نے کبھی شکایت کا موقعہ ہی نہیں دیا تھا۔اس کے مقابلے میں شرمین ہمیشہ مولوی کے لیے دردِ سر بنی رہتی۔شکل وصورت اور رنگ روپ میں فرمین سے کافی دبتی تھی اس لیے اور کئی حیلوں بہانوں سے نمایاں ہونے کی کوشش میں لگی رہتی۔کبھی بھڑکیلا لباس تو کبھی تیز میک اپ بات بے بات قہقہے لگانا۔جن کی آواز سے مولوی کو سخت چڑ تھی۔مولوی کا بس نہیں چلتا تھا کہ بے فکری سے قہقہے لگاتی ہوئی شرمین کا گلا دبوچ لے کیونکہ مولوی کے خیال میں ”عورتوں کو زیادہ وقت گھر داری، عبادت، توبہ استغفار اور گریہ زاری میں گزارنا چاہیے کیونکہ اپنے ناشکرے پن کی وجہ سے جہنم میں زیادہ عورتیں ہی ہوں گی اور انہیں اس دنیا میں ہی اپنی بخشش کا سامان کرنا چاہیے۔“

مولوی امیرالدین کو فکر تھی کہ کسی طرح شرمین کے ہاتھ پیلے کر دے۔کئی جاننے والوں سے رشتے کے بارے میں کہہ رکھا تھا مگر جب بھی کوئی رشتہ آتا شرمین کوئی نہ کوئی ڈرامہ رچا کر لوگوں کو گھر سے بھگا دیتی اور سیّدانی کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اس کی نادانیوں پر پردہ ڈال دیتی۔دراصل شرمین کو شادی کے نام سے ہی نفرت تھی۔ابا اور اماں کے بے جوڑ رشتے کی نوعیت دیکھ کر تو وہ شادی کے نام سے ہی کانوں کو ہاتھ لگاتی

تھی کیونکہ وہ ابا جیسے کسی اور شخص کے پلے پڑ کر گھٹ گھٹ کر مرنا نہیں چاہتی تھی۔

اس قدر بے رنگ زندگی سے شرمین سمجھوتہ نہیں کر پا رہی تھی۔ ایک دن بڑے بھائی کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے اس نے رنگین ٹی وی اور وی سی آر کرایے پر لے لیا۔ مولوی امیر الدین جیسے ہی گھر میں داخل ہوا۔ غیر مانوس سی آواز سن کر اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ لونگ روم میں ٹی وی اور وی سی آر دیکھ کر تو وہ جیسے پاگل ہی ہو اٹھا۔ پہلے تو بیوی کی خوب خبر لی۔ کہ وہ جہنمی عورت تھی جو اولاد کو غلط راہ پر لگا رہی تھی۔ سیدانی کے ترکی بہ ترکی جواب کے نتیجے میں آج پہلی بار مولوی امیر الدین کا ہاتھ اس پر اٹھ گیا تھا۔

''ہائے پاجی۔ مردود۔ ظالم۔ ارے لوگو دیکھو۔ بڑھاپے میں زندگی بھر کے صبر کا کیا صلہ مل رہا ہے۔ ارے میں تو سہاگن سے رانڈ بھلی۔ یہ خصم نہیں۔ سینے کا زخم ہے۔ ہائے کدھر جاؤں میرے مولا۔ ایسے دوزخی سے کب رہائی ملے گی۔'' آج سیدانی کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا تھا۔ ''ٹھہر جا حرامزادی۔ حرافہ۔ ابھی مزہ چکھاتا ہوں تجھے۔۔۔'' ایک اور زناتے دار تھپڑ سیدانی کا دوسرا گال بھی گلال کر گیا۔ سیدانی نے سینہ پیٹ پیٹ کر لال کر لیا۔ مولوی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بیٹے کو پیٹنا شروع کر دیا۔ شرمین بھاگ کر بیڈ روم میں جا چھپی۔ بڑا سا لوہے کا راڈ اٹھا کر مولوی نے پوری قوت سے ٹی وی اور وی سی آر توڑنے شروع کر دیئے۔ جیسے اس کے اندر الہ دین کے چراغ کا جن گھس گیا ہو۔ ٹی وی اور وی سی آر پر زور آزمائی سے تھک جاتا تو بیٹے کو پیٹنا شروع کر دیتا۔ بیٹا بھی ایسا بسم اللہ کا تخم کہ اُف تک نہیں کی۔ وگرنہ کڑیل جوان تھا۔ باپ کا ہاتھ تو روک ہی سکتا تھا۔ مگر مولوی امیر الدین نے گھر میں اپنی کچھ ایسی دہشت پھیلا رکھی تھی کہ کوئی اس کے مقابل نہ آتا۔ سیدانی اپنے گال سہلاتی ہوئی جھر جھر روئے جا رہی تھی۔ آج تو اس نے مولوی امیر الدین کو بے نقط سنا ڈالیں گویا اگلے پچھلے

سب حساب برابر کر ڈالے۔'' بے غیرت، رانڈ۔ تیری کبھی بخشش نہ ہوگی۔ تو دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں پھینکی جائے گی۔۔۔ ناشکری۔۔۔ بے حیا۔'' مولوی بکتا جھکتا گھر سے باہر چلا گیا۔

گھر میں درجہ حرارت ابھی کم نہیں ہوا تھا۔ دوسرے دن پھر ہنگامہ ہو گیا۔ مولوی کا خیال تھا کہ شرمین اور ریان دونوں کی اب شادی کر دینی چاہیے۔ ریان کے لیے تو اس نے رشتے کے بھائی کی بیٹی سے۔ بغیر کسی سے مشورہ کیے۔۔۔ پاکستان میں بات طے کر لی تھی، آج سیدانی نے اسے فون پر بات کرتے سنا تو گھر پھر سے پانی پت کا میدان بن گیا۔ سیدانی کا موقف تھا کہ'' بچے جب پاکستان میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتے تو تم کیوں بضد ہو؟'' '' دیکھتا ہوں کس میں میرے فیصلے کے خلاف جانے کی مجال ہے۔ یہ سب تیری ہی شہہ کا نتیجہ ہے۔ تو ہی ایک دوزخن ہے اس گھر میں۔ اور سب کو اپنے ساتھ جہنم میں لے کر جائے گی۔'' مولوی امیر الدین پھر شعلہ بیانی پر اتر آیا تھا۔ اس سے پہلے کہ سیدانی کوئی جواب دیتی۔ دروازے پر کسی نے کال بیل بجا دی۔ اور سیز فائر ہو گیا۔ اب ہر دوسرے تیسرے روز شادی کے مسئلے کو لے کر جھگڑا کھڑا ہو جاتا۔ پھر یوں ہوا کہ مطلع بالکل صاف ہو گیا۔ شادی کے ذکر سے جیسے مولوی کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ گھر بھر پر سکون سا ہو گیا تھا۔ اس کایا پلٹ پر سب حیران سے تھے۔ مولوی اور سیدانی میں بات چیت ابھی تک بند تھی۔

چند ہفتوں کے بعد مولوی امیر الدین نے ایک دن اچانک اعلان کر دیا کہ وہ کچھ عرصے کے لیے پاکستان جا رہا تھا۔۔۔ سب نے سکھ کا سانس لیا۔۔۔ تقریباً دو ماہ پاکستان میں رہ کر مولوی امیر الدین واپس انگلینڈ آیا تو اس کے رنگ ڈھنگ ہی نرالے تھے۔ خوشی چہرے سے پھوٹی پڑتی۔ بات بات پہ باچھیں کھل جا رہی تھیں۔ سیدانی اور بچوں نے اسے اس سے پہلے کبھی اتنا نرم خو، ہنس مکھ اور مرنجاں مرنج نہیں

دیکھا تھا۔ انہیں اندازہ ہی نہ ہوا کہ اس پرسکون تالاب کی تہہ میں کیسے کیسے طوفان چھپے بیٹھے تھے۔ مگر پوچھنے کی جرات کس میں تھی؟

چند روز بعد مولوی امیر الدین نے بیوی بچوں کو لونگ روم میں بلا کر ایک لرزہ خیز انکشاف کر دیا۔ ''ہم عزت دار خاندانی لوگ ہیں۔ باپ دادا کی قائم کی ہوئی روایات پر مرنے والے۔ زبان کا پاس رکھنے والے۔ غیرت مند لوگ اپنی منگ کبھی نہیں چھوڑتے۔ اس لیے خاندانی عزت اور ناموس کو بچانے کی خاطر میں نے ریان کی منگیتر سے پاکستان میں شادی کر لی ہے۔''

بچوں کے چہرے شرم سے زمین میں گڑ گئے۔۔۔ سیدانی کے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی اور اس نے آہ و بکا شروع کر دی۔ ''ہائے ہائے اٹھارہ سال کی معصوم بچی تیری ان بیٹیوں سے چھوٹی۔ یہ کیا ظلم کیا تو نے۔ ہائے ہائے وہ اپنا سر پیٹتی جا رہی تھی۔ کیسے لوگوں سے نظر ملاؤں گی۔ ان بیٹیوں کی ڈولیاں اس گھر سے کیسے اٹھیں گی۔ اے میرے مولا۔ مجھے اٹھا لے۔ اب کچھ اور دیکھنے کی حسرت نہیں ہے۔۔۔'' وہ انتہائی دردناک انداز میں بین کر رہی تھی۔ مگر مولوی امیر الدین سنی ان سنی کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

شرمین کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ باہر سڑک پر جا کر چیخ چیخ کر لوگوں کو بتائے کہ غیرت کے نام پر صرف جسموں کا قتل ہی آنر کلنگ نہیں بلکہ معصوم لڑکیوں کے ارمانوں۔ ان کے جذبوں، ان کی آرزوؤں ان کی امنگوں اور خوابوں کا قتل بھی آنر کلنگ ہی ہے۔۔۔!

مگر ایسے قتل کی سزا۔۔۔۔؟

○

تھرڈ ڈائمنشن

(Third Dimension)

عنائیہ کافی عرصہ سے آڈاپشن ایجنسی کے ساتھ بحیثیت سوشل ورکر کام کر رہی تھی ڈیوٹی ڈیسک پر آج سارا دن اسے ہی رہنا تھا کیونکہ مسلمان آڈاپٹرز کی ریکروٹمنٹ کا ایک خاص کیمپین چلایا جا رہا تھا اور توقع تھی کہ اس ہفتے میں مسلمان آڈاپٹرز کی طرف سے کافی انکوائریز آئیں گی۔

آڈاپشن ایجنسی کے پاس یوں تو بہت سے مسلمان بچے آتے رہتے تھے مگر یہ خالصتاً پاکستانی بچے نہیں ہوتے تھے۔ اکثر و بیشتر یہ ملٹی ایتھنک بیک گراونڈ کے بچے ہوتے یعنی اگر ماں انگریز ہوتی تو باپ پاکستانی، عراقی، ایرانی یورپین یا ایسٹ افریقہ سے تعلق رکھتا۔ کبھی کبھار ماں کا تعلق کثیر الثقافتی پس منظر سے ہوتا۔ مگر آڈاپشن کے لیے آنے والے اکثر خاندان پاکستانی مسلمان بیک گراونڈ سے تھے جس میں اکثریت کی خواہش ہوتی کہ وہ بہت چھوٹا بچہ ہی گود لیں اور وہ خالصتاً پاکستانی بیک گراونڈ سے ہو۔ یا پھر وہ پاکستان، انڈیا، یا بنگلہ دیش سے اپنے عزیزوں میں سے کسی کا بچہ گود لینا چاہتے تھے۔

آج بھی ڈیوٹی پر کیمپین کے نتیجے میں ایسی ہی انکوائریز کی بھرمار تھی۔ عنائیہ تمام

دن یہ بات دہراتے دہراتے تھک سی گئی تھی کہ ''اگر بچے کے والدین حیات ہیں تو آپ ایسے بچے بیرون ملک سے گود نہیں لے سکتے۔ کیونکہ آڈاپشن ایجنسی کو ان کی اسسمنٹ کرنا ہوتی ہے اور ہم کبھی بھی اس بات کو پروموٹ نہیں کریں گے کہ بچہ کسی دوسرے بے اولاد جوڑے کو گفٹ کر دیا جائے۔ کیونکہ بچہ کوئی کموڈٹی تو نہیں ہے جسے تحفے میں دے دیا جائے۔ اس میں آگے چل کر بہت سی قباحتیں ہو جاتی تھیں اور ایسے بچے شدید عدم تحفظ کا شکار ہو جاتے کہ ان کے والدین نے صرف انہیں ہی کیوں اپنے باقی ماندہ خاندان سے اور خود سے جدا کر کے کسی اور کا گھر آباد کر دیا۔ اس کے علاوہ انٹر کنٹری آڈاپشن میں پندرہ سے بیس ہزار پونڈ کی لاگت بھی آتی ہے کیونکہ گود لینے والے خاندان کو آڈاپشن ایجنسی کی فیس، ٹریننگ کے اخراجات، وکیل کی فیس، ملک میں آنے جانے کا کرایہ۔ ایمگریشن کے اخراجات سب خود ہی اٹھانے پڑتے جبکہ لوکل آڈاپشن کی صورت میں کوئی لاگت نہیں آتی۔ اور آڈاپشن کے تمام مراحل بھی کم وقت میں طے پاتے ہیں۔''

آج صبح ہی صبح ایک انکوائری نے اس کا کافی وقت لے لیا۔ آڈاپشن کرنے والے پاکستانی جوڑے کا اصرار تھا کہ وہ بہت چھوٹا بچہ گود لینا چاہتے تھے تا کہ وہ ''اسے بریسٹ فیڈنگ کر سکیں تا کہ بچے سے والدہ کا حرمت کا رشتہ برقرار ہو سکے وگرنہ بڑے ہو کر تو وہ بچہ ماں کے لیے نامحرم ہی رہتا۔'' عنائیہ ان کے مسئلے کو سمجھتی تھی اور کئی بار یہ بات آڈاپشن ایجنسی کے باس سے کہہ چکی تھی کہ جب تک وہ مسلمان بچوں کے آڈاپشن کے سلسلے میں باقاعدہ لائحہ عمل اختیار نہیں کریں گے۔ گود لینے والے مسلمان خاندان اس طرح کے بہت سے سوالات اٹھاتے رہیں گے۔ اور مسلمان بچوں کی

مسلمان گھرانوں میں آڈاپشن تقریباً ناممکن ہو جائے گی۔ کئی بار اس نے تجاویز دیں کہ انہیں مقامی مساجد کے علماء اکرام سے اس سلسلے میں گفتگو کر کے مسئلے کی نوعیت بتا کر کوئی فتویٰ لینا چاہیے تا کہ آڈاپشن کرنے والے مسلمان جوڑے جائز شرعی تقاضوں کے مطابق اطمینان سے بچوں کو گود لے سکیں۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔۔۔ صرف زبانی جمع خرچ ہوتا یعنی Lip service۔۔۔۔!

اور مسلمان جوڑوں کا مسئلہ جوں کا توں رہتا۔

ان حالات میں اکثر مسلمان بچے غیر مسلم گھرانوں کو گود دے دیئے جاتے کیونکہ ایجنسی کا موقف تھا کہ بچوں کو ایک پیار محبت کرنے والا خاندان چاہیے جو اس کی مثبت نشوونما میں معاون ثابت ہو۔ مذہب کے بارے میں ان کا نقطہ نظر سیکولر تھا مگر عنائیہ کو اس بات سے بہت پریشانی لاحق ہوتی کہ غیر مسلم گھرانے ایک مسلمان بچے کو کب اسلامی تشخص کے ساتھ پروان چڑھائیں گے۔ بچہ مذہب سے دور ہو جائے گا اور کل کو وہ مذہبی اور ثقافتی شناخت کے مسئلے سے دوچار ہو جائے گا۔ مگر یہاں کس کو اس بات کی پرواہ تھی ایجنسی کا مقصد تو بچوں کے لیے ایسے خاندان تلاش کرنا تھا جو ان چکروں میں پڑے بغیر بچوں کو گود لے سکیں۔

آج ایجنسی کا دفتر بند ہونے میں تھوڑا ہی وقت رہ گیا تھا کہ ایک ایشیائی نوجوان آڈاپشن انکوائری کے لیے دفتر میں آ گیا۔ اس کی باڈی لینگویج اور حرکات وسکنات سے لگ رہا تھا کہ اس کا تعلق تیسری ڈائمنشن سے ہے یعنی کہ وہ Gay ہے۔ مگر عنائیہ کچھ کنفیوزسی لگ رہی تھی اس کی سیکشولیٹی کے بارے میں تاہم ریسپشن پر موجود انگریز لڑکیوں کا خیال تھا کہ ''وہ اصلی Gay نہیں تھا بلکہ پوز کر رہا تھا۔'' اس میں

بھلا پوز کرنے والی کونسی بات ہے؟'' پھر عنایہ کا ذہن الجھ سا گیا۔ بحر حال اس سے بات کرنا ضروری تھا۔ عنائیہ نے ریسپشن میں جا کر اپنا تعارف کروایا تو وہ بے حد خوش ہو گیا کہ سوشل ورکر اس کی ہم وطن تھی اور انگریزی کے علاوہ اردو اور پنجابی زبان بولنے میں بھی مہارت رکھتی تھی۔

عنائیہ اسے انٹرویو روم میں لے گئی اور انکوائری کے کاغذات مکمل کرنے کی غرض سے کئی سوالات کر ڈالے۔ ندیم نے بتایا کہ ''اس کا تعلق پاکستان کے ایک بڑے شہر سے تھا اور وہ تین بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ اس کی منگنی اپنی کزن سے ہو چکی تھی مگر اسے عورتوں سے کوئی رغبت نہ تھی اس لیے اس نے ملک سے بھاگ کر یہاں آ کر پولیٹیکل اسائلم لے لی ہے۔''

عنائیہ کا ذوق تجسس بڑھ رہا تھا تو اس نے مزید سوال کر دیا کہ ''کیا اس کے گھر والوں کو علم ہے کہ وہ Gay ہے؟'' تو وہ کہنے لگا ''نہیں یہ بات ان کے علم میں نہیں ہے اور میں بتا بھی نہیں سکتا تھا ورنہ مجھے اتنے جوتے پڑتے کہ خدا کی پناہ۔۔۔ آپ کو تو پتہ ہے ناں باجی اسلام میں یہ منع ہے مگر میں کیا کروں۔ میری مجبوری ہے۔ مجھے صرف مرد ہی اچھے لگتے ہیں'' اب وہ زیادہ تر گفتگو اردو میں ہی کر رہا تھا۔ ''میں شادی کر کے کسی عورت کی زندگی برباد کرنا نہیں چاہتا تھا اس لیے میں کچھ بتائے بغیر ملک چھوڑ کر آ گیا ہوں مگر میں باقاعدگی سے گھر والوں کو خرچہ بھیجتا رہتا ہوں۔ میں نے اپنے دوسری ذمہ داریوں سے منہ نہیں موڑا۔'' اس نے گویا ہمدردی سمیٹنے کے لیے مزید وضاحت کی۔

عنائیہ کی دل چسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے مزید کریدا کہ ''اس قسم کی زندگی

گزارتے ہوئے کیا وہ آئسولیٹڈ نہیں ہو جاتا یا ایسے مزید ایشائی لوگ موجود ہیں جن نے وہ اپنی نیٹ ورکنگ کر سکے؟" تو ندیم نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ "یہاں بہت سے ایشیائی مسلمان Gays ہیں اور باقاعدہ ان کے کلب ہیں جہاں ہم سب باقاعدگی سے ملتے ہیں۔" "اس وقت تمہارا کوئی پارٹنر ہے یا اکیلے ہی ہو۔" عنائیہ نے آڈاپشن کے نقطہ نظر سے پوچھا کیونکہ اگر اس کا پارٹنر ہوتا تو اسے بھی آڈاپشن کے لیے اکٹھے درخواست دینا پڑتی۔ تاکہ ان دونوں کی اسسمنٹ اکٹھی کی جائے۔ ندیم نے بتایا کہ "اس کا پارٹنر اسے کچھ عرصہ پہلے چھوڑ گیا تھا اور آج کل وہ اکیلا ہی ہے۔" انکوائری مکمل کر کے عنائیہ نے اسے باقی کا طریق کار سمجھا دیا اور کہا کہ جلد ہی ایجنسی کی سوشل ورکر اس سے رابطہ کر کے مزید معلومات کے لیے گھر پر آئے گی۔"

ندیم کے جانے کے بعد عنائیہ سوچتی رہی کہ لواطت کے بارے میں کتنی سخت وعید آتی ہے اسلام میں۔ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کا کیا حشر ہوا تھا؟ اس کا دل چاہتا تھا کہ ایسے کڑیل جوان کو اس قسم کی غیر اخلاقی زندگی سے روکے۔ جہنم کے عذاب کا خوف دلا کر باز رکھے مگر اس کی پروفیشنل مجبوریاں اسے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔

جب کبھی بھی ایجنسی میں GLB ٹرینگ ہوتی یعنی Gay, Lesbian and Bisexual تو وہ منافقوں کی طرح وہاں خاموش بیٹھی رہتی کیونکہ یہ سب اس کے اسلامی عقائد کے خلاف تھا اور وہ دل میں اس قسم کی جنسی زندگی کی قائل نہیں تھی مگر "ہر ایک کی اپنی زندگی ہے۔ اس میں میں کیا کر سکتی ہوں۔" عنائیہ نے بے چارگی سے سوچا۔

چند ہفتوں کے بعد ندیم کا فون آ گیا کہ باجی مجھے اب نیا پارٹنر مل گیا ہے میں نے اسے سمجھایا کہ اب نیا پارٹنر ملنے کی صورت میں اسے کم از کم دو سال تک انتظار کرنا پڑے گا کیونکہ آڈاپشن میں آپسی تعلقات کے لیے یہ کم سے کم مدت رکھی گئی ہے تاکہ گود لینے والے جوڑے پہلے اپنے تعلق کو اچھی طرح سمجھ کر مضبوط کر سکیں۔ ندیم کی انکوائری بند کر دی گئی۔ چند مہینے کے بعد ندیم پھر ایجنسی کے دفتر آ گیا۔ اب کی بار اس کے ساتھ ایک اور لڑکا تھا۔ اس نے اس کا تعارف راشد کہہ کر کروایا۔ اس نے بتایا کہ وہ اس کا نیا پارٹنر تھا اور دونوں جلد ہی شادی کرنے والے تھے۔ ریسپشن میں کھڑے کھڑے باتیں کرنا مناسب نہ تھا کیونکہ سب ہی لوگ متوجہ ہو رہے تھے۔ اس لیے عنائیہ انہیں انٹرویو روم میں لے گئی تاکہ اطمینان سے بات کر سکے۔

عنائیہ کچھ متجسس تھی اور ان سے Gay میرج کے بارے میں مزید جاننا چاہتی تھی۔ بیٹھتے ہی اس نے سوال کیا کہ ''کیا ایسی شادیوں میں بھی میاں بیوی کا کوئی تصور ہوتا ہے یا نہیں؟'' ندیم نے وضاحت کی کہ ''ہاں بالکل ہوتا ہے جیسے میں بیوی ہوں گا اور راشد میرا خاوند ہو گا ہم اسے ٹاپ اور باٹم پوزیشن کہتے ہیں۔ میں سب بیوی والے کام کروں گا۔'' عنائیہ نے پھر سوال کیا کہ ''بیوی والے کام'' سے اس کا کیا مطلب ہے؟ ''کھانا پکانا۔ صفائی ستھرائی سودا سلف۔ بل اور اخراجات کا حساب کتاب وغیرہ وغیرہ۔'' ندیم نے جواب دیا'' اور بچے پیدا کرنا کہاں گیا جو کہ بیوی بننے والی عورت کا اہم فریضہ ہے اور عورت اگر ماں نہ بن سکے تو بانجھ عورت کو تو معاشرہ عورت تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیتا ہے۔'' عنائیہ نے چبھتا ہوا سوال کر کے گویا ندیم کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ ندیم نے شرمندگی سے جواب دیا۔ ''باجی یہ تو ہماری مجبوری ہے ناں۔

اسی لیے تو ہم آڈاپشن کرنا چاہتے ہیں کیونکہ مجھے بچے بہت اچھے لگتے ہیں اور فطری طریقے سے تو ہم بچے پیدا نہیں کر سکتے۔" عنائیہ کا دل چاہا کہ اسے دو تھپڑ رسید کر کے کہے کہ "پھر یہ غیر فطری حرکتیں کیوں کر رہے ہو۔ کچھ خوف تمہیں آخرت کا ہے کہ نہیں!" مگر وہ خاموش رہی۔

اس تمام گفتگو کے دوران اس کا پارٹنر راشد بالکل خاموش تھا۔ اور اس نے گفتگو میں بالکل حصہ نہیں لیا حالانکہ ساری بات چیت اردو اور پنجابی میں ہو رہی تھی۔ عنائیہ نے مزید نوٹ کیا کہ راشد اس سے آئی کونٹیکٹ نہیں کر رہا تھا بلکہ مسلسل زمین کی طرف سر جھکائے گھور رہا تھا۔ جس سے عنائیہ کو شک ہو رہا تھا کہ وہ واقعی Gay تھا یا۔۔۔؟ اس نے مزید کریدتے ہوئے راشد کے حالات کے بارے میں سوالات کرنے شروع کر دیئے تو ندیم نے بتایا کہ "وہ کچھ عرصہ پہلے ہی پاکستان سے یہاں آیا ہے اور پولیٹیکل اسائلم ویزے پر ہے۔ شادی کے بعد میں اس کے پرمنٹ ویزے کے لیے درخواست دوں گا۔"

پہلی بار راشد نے زبان کھولی اور کہا "ہم دونوں چاہے شادی کرلیں لیکن میں اس کی اصلی شادی ضرور کرواؤں گا۔"

راشد کا یہ جملہ عنائیہ کے لیے بہت بڑا سوال چھوڑ گیا کہ کیا یہ دونوں واقعی Gay ہیں یا پھر صرف پولیٹیکل اسائلم اور ویزے کے چکر۔۔۔۔۔!!!

O

گلاس کٹر
(Glass Cutter)

ماہین جس نئے محلے میں شفٹ ہوئی تھی وہاں ان کی سٹریٹ کے کونے پر ہی ''گلاس کٹر'' کا بہت بڑا بورڈ لگا ہوا تھا۔ وہ جب بھی وہاں سے گزرتی تو بچپن میں سکول میں پڑھی ہوئی وڈ کٹر کی کہانی پتہ نہیں اسے کیوں یاد آ جاتی۔ اب اتنے برسوں بعد اسے کہانی پوری طرح تو یاد نہیں تھی بس اتنا ہی یاد آ رہا تھا کہ ایک بڑا ایماندار وڈ کٹر ہوتا ہے۔ اسے کئی طرح کے لالچ دیئے جاتے ہیں اور آخر میں اس کا کلہاڑا سونے کا بن جاتا ہے۔ یہ اس کی ایمانداری کا صلہ تھا۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا کہ وہ ''گلاس کٹر اور وڈ کٹر'' دونوں میں مماثلت تلاش کرنے کی کوشش کیوں کر رہی تھی۔ اوہ۔۔ ''مگر وہ کب مماثلت تلاش کر رہی ہے۔ یہ تو خود بخود ہی وڈ کٹر اور کلہاڑا اس کے ذہن میں چلے آتے ہیں۔'' وہ خود کو جواب دیتی۔ آتے جاتے وہ اکثر ایک ادھیڑ عمر انگریز کو وہاں کھڑے دیکھتی تھی۔ ''شاید وہاں کام کرتا ہوگا۔'' اس نے سوچا۔ ''یا پھر اس کا بزنس ہوگا۔'' مگر چہرے سے وہ بہت معصوم سا لگتا تھا۔ جب کبھی وہ گزرتی مسکراہٹوں کا تبادلہ ضرور ہوتا مگر کبھی انہوں نے ایک دوسرے سے ہیلو ہائے نہیں کیا تھا۔

نئے گھر کو سیٹ کرنے میں مہینوں لگ گئے۔ کتنا کاٹھ کباڑ اکٹھا کر رکھا تھا۔ پرانا گھر بہت بڑا تھا اور بچے بڑے ہو کر ملازمتوں کے سلسلے میں شہر سے باہر چلے گئے تو پانچ بیڈ روم کا گھر ان کی ضرورت سے بہت بڑا لگتا۔ اس عمر میں مکان کی دیکھ ریکھ سلمان سے نہیں ہو پا رہی تھی۔ کمر کا درد انہیں بیٹھنے کی اجازت نہ دیتا۔ اگر کبھی ایک آدھ گھنٹہ گارڈننگ کر لیتے تو دنوں ہائے ہائے کرتے رہتے۔ بڑے گھر کا کونسل ٹیکس۔ واٹر ریٹ بھی زیادہ تھا۔ مکان کی ہیٹنگ پر بجلی گیس کا کافی خرچ اٹھ جاتا۔ بچے تو کبھی کبھار گھر آتے اور ایسے میں دو افراد کونے میں دبکے رہتے۔ ڈاؤن سائزنگ کر کے انہوں نے تین بیڈ روم کا گھر لے لیا تھا مگر ماہین میں اتنی ہمت نہ تھی کہ پرانے گھر میں سب چیزوں کو سارٹ آؤٹ کرتی کیونکہ مکان بہت جلدی بک گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کم از کم چھ ایک ماہ تو لگ ہی جائیں گے بکتے بکاتے مگر جیسے ہی مکان مارکیٹ میں آیا۔ پہلے ہی گاہک کو مکان پسند آ گیا اور تین مہینے کے اندر اندر کنٹریکٹ ایکسچینج ہو گئے تو مقررہ تاریخ پر انہیں گھر خالی کرنا پڑا۔

یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں بھی من پسند علاقے میں تین بیڈ روم کا صاف ستھرا مکان جلد ہی مل گیا جو ان کی ضرورتوں کے عین مطابق تھا۔ کپڑوں اور چیزوں کی سارٹنگ کرتے ہوئے ماہین نے کئی طرح کے بیگ تیار کر لیے تھے۔ جن میں ایک تو بہت اچھی حالت کے کپڑوں کا بیگ تھا جسے اس کا خیال تھا۔ رشتے کی بہنوں کو دے دے گی۔ یا اگر کوئی پاکستان جانے والا ہوا تو وہاں غریب رشتہ داروں کو گرم کپڑے بجھوا دے گی۔ بیچارے دعائیں دیں گے۔ ایک بیگ اسلامک ریلیف کے لیے تھا۔ اور بہت زیادہ استعمال شدہ کپڑے اس نے ری سائکلینگ کے لیے نکال دیئے تھے۔ اس کے علاوہ بھی کافی اچھی چیزیں تھیں، زیادہ تر بچوں کے استعمال کی جواب اس کے کسی کام کی نہ تھیں مگر پھینکے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ جس کے لیے اس نے اوپن

ہاؤس تقریب کرنے کا فیصلہ کرلیا تاکہ سب سہیلیاں عزیز رشتہ دار آ کر جو کسی کو لینا ہو مفت لے جائیں۔

کئی ہفتے اسی انتظام وانصرام میں گزر گئے بہت سی غیرضروری چیزیں گھر سے رخصت ہوئیں تو جیسے ماہین نے سکون کا سانس لیا گھر ہلکا پھلکا سا ہو گیا تھا۔ اب جو چیزیں گھر میں رہ گئی تھیں ماہین نے ان کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ''اب ان کو بھی اٹھا کر باہر نہ پھینک دینا۔'' اس طرح سنجیدگی سے ایک بار پھر سامان کا جائزہ لیتے دیکھ کر سلمان نے فقرہ اچھالا۔ ''سلمان میں اچھی چیزوں کو تو اٹھا کر باہر نہیں پھینک رہی۔ جو چیزیں ہمارے کام کی نہیں رہیں کسی اور کے کام آجائیں گی۔ آخر پیسے خرچ کر کے خریدی تھیں۔ مفت تو نہیں ملی تھی۔'' ''میں نے کب کہا کہ تم اچھی بھلی چیزوں کو باہر پھینک رہی ہو۔ بس ایسے ہی دل لگی کر رہا تھا تمہارے ساتھ'' سلمان کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے ماہین کی نظر اچانک اپنی مہاگنی کی کافی ٹیبل پر پڑی۔ جو اس نے کافی عرصے پہلے منجھلی بیٹی کی پیدائش پر خریدی تھی۔ بلکہ سلمان نے اسے گفٹ کی تھی اور ساتھ میں ایک ٹیبل نیسٹ بھی تھا۔ بیٹی کی طرح اسے اس کافی ٹیبل سے بہت انس تھا۔ ''کس قدر گرد وغبار بیٹھ گیا ہے کافی ٹیبل پر''۔ وہ خود سے گویا ہوئی۔ ''یہ گھر کی ادل بدل میں تو اچھے خاصے فرنیچر کی درگت بن گئی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ سب فرنیچر درست حالت میں نئے گھر میں پہنچ گیا ہے۔'' مگر جیسے ہی اس کی نظر ٹیبل نیسٹ پر پڑی اس کا دل دہل گیا۔ ایک درمیانے سائز کی ٹیبل کا شیشہ بری طرح چکنا چور ہو چکا تھا۔ ''اب کیا ہوگا۔ کہاں سے اس کا شیشہ آئے گا۔ شیشہ نہ ملا تو؟ اس کا لیدر تو ستیاناس ہو جائے گا۔'' اس نے خود سے کئی سوال کر ڈالے۔

سلمان نے اسے یوں پریشان دیکھ کر کہا کہ ''اس میں اس قدر پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ یہ تمہاری گلی کی نکڑ پر تو اتنا بڑا گلاس کٹر کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ پوری فیکٹری ہے یہاں گھر کے پاس اور تم اتنے سے شیشے کے لیے پریشان ہو رہی ہو۔ سارے گھر کے شیشے بھی توڑ ڈالو تو پرواہ نہیں ہے وہ بوڑھا انگریز جو تمہیں آتے جاتے مسکراہٹیں پھینکتا رہتا ہے۔ وہ آخر کس دن کام آئے گا۔''

ماہین نے سلمان کا طنز نظر انداز کرتے ہوئے سوچا کہ پتہ نہیں اسے آج گلاس کٹر کیسے بھول گیا تھا۔ ''اوہ یس'' وہ جیسے خوشی سے جھوم اٹھی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ گلاس کٹر کے ریسپشن میں کھڑی تھی اور وہی بوڑھا انگریز وہاں پر موجود تھا۔ مسکراہٹوں کا ایک بار پھر تبادلہ ہوا اور ماہین نے اسے بتایا کہ ''اس کے چھوٹے ٹیبل کا شیشہ چکنا چور ہو گیا ہے اور یہ کافی پرانا کافی ٹیبل کا سیٹ ہے۔ معلوم نہیں س طرح کا میچنگ شیشہ اب ملے گا بھی یا نہیں۔'' وہ کہے جا رہی تھی۔ اس کی بات سن کر بوڑھے انگریز نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔''

''Don't worry, we will sort it out for you, Madam.''

شیشے کا سائز ساتھ لے کر آنا وہ بھول گئی تھی۔ تو بوڑھے انگریز نے کہا کہ وہ اس کے ساتھ گھر جا کر خود اس کی پیمائش کرے گا اور شام تک اسے شیشہ کاٹ کر ٹیبل میں سیٹ کر دے گا۔

شام ٹھیک سات بجے دروازے کی گھنٹی بجی تو ماہین نے جا کر دروازہ کھولا کیونکہ سلمان گھر پر نہیں تھا۔ سامنے بوڑھا انگریز ہاتھ میں ٹیبل کا شیشہ پکڑے کھڑا تھا۔ ماہین نے اسے اندر آنے کو کہا تو اس نے اندر آ کر ٹیبل پر شیشہ فٹ کرنا شروع کر دیا اور

ساتھ پچیس پونڈ کا بل ماہین کے ہاتھ میں تھما دیا۔ بوڑھے کو ذرا انتظار کرنے کا کہہ کر وہ پرس میں سے پیسے لینے گئی۔ دیکھا تو پرس میں ایک پانچ پونڈ کے نوٹ کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ پریشان سی ہو اٹھی۔ ''اب اس کا بل کیسے چکائے گی؟'' آئی ایم شور۔ میرے پرس میں کم از کم پچاس پونڈ تھے۔ تو پیسے کہاں گئے؟ کیا سلمان نے لیے ہیں، مگر کیوں؟ سلمان نے تو کبھی بتائے بغیر میرے پرس سے پیسے نہیں لیے۔'' اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اب وہ کیسے جا کر اسے بتائے کہ اس کے پاس اس وقت پیسے نہیں ہیں۔ کس قدر شرمندگی ہو رہی تھی اسے۔ کیا سوچے گا وہ۔۔۔! '' یہی سوچ سوچ کر وہ پشیمان ہو رہی تھی۔ وہ اب اسے مزید انتظار نہیں کروا سکتی تھی اور نہ ہی سلمان کے گھر لوٹ آنے کا انتظار کر سکتی تھی۔ اس نے واپس جا کر بوڑھے انگریز کو دیکھا وہی معصوم سی مسکراہٹ چہرے پر سجائے وہ فرنٹ روم میں کھڑا تھا۔ اس نے جھجکتے جھجکتے اسے بتایا کہ ''بل ادا کرنے کے لیے اس وقت اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ چاہے تو وہ شیشہ واپس لے جا سکتا ہے یا پھر ہم کل بل ادا کر دیں گے۔'' ماہین کی بات سن کر بوڑھے انگریز نے اسی مسکراہٹ سے کہا:

"Don't worry, I trust you....you. have an honest face"

اتنا کہہ کر وہ بائے بائے کہتا ہوا چلا گیا اور ماہین کو وہیں سراسیمہ سا چھوڑ گیا۔ وڈ کٹر۔۔۔ گلاس کٹر۔۔۔ ایمانداری۔۔۔ پرخلوص چہرہ۔۔۔ سب گڈمڈ سے ہو رہے تھے۔ آج یہ عجیب سا تعلق ماہین کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ اور وہ سوچ رہی تھی کہ اچھے برے لوگ ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ انگریزوں میں بھی اچھے لوگ ہیں اور ہمارے اپنوں میں بھی برے لوگ ہیں۔ ہمیں تعصب کی عینک اتار کر۔۔۔۔!

○

گاربیج
(Garbage)

سدرہ کو شروع سے ہی کوڑا کرکٹ اٹھانے والی بڑی سی گاڑی بہت فیسی نیٹنگ لگتی تھی۔ ہفتہ میں ایک مرتبہ عین مقررہ وقت پر بڑے بڑے پہیوں والی گاڑی زوں زوں کرتی سڑک پر شور مچانا شروع کر دیتی تھی۔ کچرے کا تماشہ دیکھنے کے لیے وہ ہمیشہ ہی کھڑکی کے پاس آ کر بیٹھ جاتی اور جب تک گاڑی ان کے محلے سے کچرا اٹھا کر چلی نہ جاتی وہ کھڑکی سے چپک کر بیٹھی رہتی۔

وہ جب بھی گاربیج اٹھانے والی گاڑی کو دیکھتی۔ کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتی مگر کوئی تعلق کوئی نسبت، کوئی واسطہ اسے کچرا اٹھانے والی گاڑی سے بنتا سجھائی نہ دیتا۔۔۔!

کرسمس کے لیے خاص طور پر کچرا اٹھانے والی گاڑی کے ملازمین ہر گھر کے دروازے پر نوک کر کے ہپی کرسمس کہتے جس کا مطلب یہ ہوتا کہ انہیں عیدی چاہیے۔ پہلے پہل تو اسے اس بات کی سمجھ ہی نہ آئی مگر جب کامران نے ہنستے ہوئے اسے بتایا کہ ”نیک بخت۔اسے کچھ پیسے دیدو۔اپنے لیے کوئی ڈرنک ورنک خرید لے گا“ تو وہ سخت جز بز ہوتی تھی۔ ”ہائے تو کیا میں اسے شراب خریدنے کے لیے پیسے دوں؟ ناں

بابا ہماری حق حلال کی کمائی شرابیوں کے لیے نہیں ہے۔"

کامران ہنستے ہوئے دلیل دیتا کہ "تمہارے پیسے نہ دینے سے کیا وہ ڈرنک کرنا چھوڑ دے گا۔ تمہیں اس سے کیا غرض ہے کہ وہ ان چند پونڈز کا کیا کرتا ہے۔ بس اب اسے اور زیادہ انتظار مت کرواؤ وہ کب سے دروازے پر تمہارا انتظار کر رہا ہے۔" اور وہ بادلِ ناخواستہ پانچ پونڈ کا نوٹ نکال کر آہستہ سے اس کی طرف بڑھا دیتی۔ جسے وہ بہت شاندار مسکراہٹ کے ساتھ تھینک یو تھینک یو کہتا ہوا وصول کر لیتا۔

سدرہ اکثر سوچتی کتنا اچھا انتظام ہے یہاں کچرا اٹھانے کے لیے۔ عام کوڑے کرکٹ کے بیگ الگ ہیں۔ ری سائیکلنگ کے لیے کاغذ۔ شیشے کی بوتلیں۔ پلاسٹک اور میٹل ٹن الگ سے اکٹھے کیے جاتے ہیں۔ اور گارڈن ویسٹ اور ہیوی آئٹمز کے الگ سے دن مقرر ہیں۔

اس قدر اچھے انتظام وانصرام کے باوجود سدرہ کبھی کبھی تو بہت چڑ جاتی کیونکہ سارا ہفتہ کچرے کو الگ الگ بیگوں اور رنگ برنگ ڈبوں میں ڈالنے کی ذمہ داری اس کی ہی تھی۔ کامران تو صرف انہیں اٹھا کر ہفتے میں ایک بار باہر رکھنے کا فریضہ انجام دیتا تھا۔ کبھی کبھی تو اسے لگتا کہ جیسے زندگی کا مقصد صرف کچرے کی خانہ شماری کرنا ہی رہ گیا ہو۔ کبھی ایک بیگ تو کبھی دوسرے ڈبے کو دیکھو جا کر۔ آج پھر کچرے والی بڑی سی زوں زوں کرتی گاڑی کو دیکھ کر اس کا ذہن پھر کہیں بھٹک سا گیا تھا۔ اسے ایکدم عرب کی وہ بڑھیا یاد آ گئی جو ہمارے حضور نبی اکرم ﷺ پر ہر روز کوڑا پھینکا کرتی تھی مگر ایک روز جب وہ بیمار ہو گئی اور کسی نے آپ ﷺ پر کوڑا نہ پھینکا تو آپ اس کی عیادت کے لیے اس کے گھر تشریف لے گئے۔ پیغمبر اسلامؐ کے حسن سلوک سے وہ

کافر بڑھیا اتنی متاثر ہوئی کہ کلمہ پڑھ کر دائرہ اسلام میں داخل ہوگئی۔آج سدرہ کے ذہن کی گتھی سلجھ گئی تھی کہ یہی بات تھی جسے وہ بہت عرصے سے سوچنے کی کوشش کر رہی تھی مگر یاد نہ کر پاتی تھی۔آج اسے کچرے، کوڑا کرکٹ اور گاڑی کے تعلق کا پتہ چل گیا تھا۔۔۔!

سدرہ کی زندگی بس ایک ہی ڈگر پر چل رہی تھی۔دونوں بچے اسکول سے نکل کر کالج اور پھر یونیورسٹیوں میں چلے گئے۔اس نے ان کی دینی اور دنیاوی تعلیم و تربیت پہ بہت زور دیا تھا۔خاص طور پر اردو زبان و ادب سے خاص محبت اور انس پیدا کر رکھا تھا جبھی تو دونوں نے ہی اردو میں اولیولز بڑے اچھے نمبروں سے پاس کر لیے تھے۔ چھوٹی بیٹی وردہ کی اردو قدرے کمزور تھی جبکہ بڑی بیٹی ثنا تو فر فر اردو بولتی تھی کیونکہ وہ کئی مرتبہ پاکستان جا چکی تھی اور اسے زبان بولنے کا زیادہ موقع ملا تھا۔

چھوٹی بیٹی میڈیکل کی تعلیم مکمل کر کے اب ہاؤس جاب کر رہی تھی۔اکثر اس کا واسطہ ایسے ایشیائی مریضوں سے پڑتا رہتا تھا جنہیں انگریزی میں بات چیت کرنے اور سمجھنے میں دقت پیش آتی۔وہ اکثر ہی فون کر کے سدرہ سے مختلف باڈی پارٹس کے اردو نام پوچھتی رہتی تھی تاکہ اسے مریضوں کو سمجھانے میں آسانی رہے۔جب سے اس نے فاؤنڈیشن ٹریننگ شروع کی تھی، اس کی اردو کافی بہتر ہوگئی تھی۔سدرہ اکثر اس کا مذاق اڑاتی کہ بچپن میں وہ اردو پڑھنے سے کتنا جی چراتی رہتی تھی۔سو سو بہانے کرتی۔کبھی کہتی ممی میری ٹنگ کام نہیں کرتی اردو بولنے کے لیے۔۔۔یا پھر اپنا قاعدہ کہیں چھپا دیا کرتی تھی۔

"Whats the point in learning Urdu?"

اکثر بحث کرنے لگتی کہ ممی یہ اردو کونسی یہاں ہمارے کام آئے گی۔ اور وہ اکثر اسے کئی قسم کے دلائل دے کر اردو پڑھنے پر آمادہ کرتی کہ ''اپنی مادری زبان ہے۔ ضرور سیکھنی چاہیے۔ چین، جاپان کو دیکھو، کیسے ترقی یافتہ ممالک ہیں مگر اپنی ہی زبان کو ذریعہ تعلیم بنا رکھا ہے۔ انگریزی ضرور سیکھو مگر اپنی زبان کو کم تر مت گردانو۔۔۔!''

وہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی تقریر جھاڑ دیتی۔ آج پھر شام کو وردہ کا فون آ گیا۔ وہ ہسپتال میں سارے دن کی روئداد گوش گزار کر رہی تھی۔ سدرہ کو بیٹی کے کنسلٹنٹ، رجسٹرار، ایس ایچ اوز اور جونیئر ڈاکٹرز تقریباً سبھی کے نام معلوم تھے روز روز کے قصے کہانیاں سن سن کر، آج وردہ بڑی خوش لگ رہی تھی ''ممی آج پتا ہے کیا ہوا۔ ایک انکل جی ہمارے وارڈ میں ہیں۔ میرے کنسلٹنٹ نے وارڈ راؤنڈ میں مجھے کہا کہ ذرا ان کو اپنی زبان میں سمجھا دو کہ ہمارا ٹریٹمنٹ پلان کیا ہے۔ تو میں نے اردو میں انکل جی سے بات کی ہے اس پر میرا کنسلٹنٹ بہت امپریس ہوا تھا کہ مجھے اردو بولنی آتی ہے۔ آپ ٹھیک کہتی تھیں ہمیں Bilingual ضرور ہونا چاہیے ورنہ تو ہم انگریزوں کی طرح ہی ہو جائیں گے۔ جو صرف انگریزی ہی بولتے ہیں۔'' بیٹی کی بات سن کر سدرہ مسکرا دی کہ بچوں کو بات سمجھنے میں کتنا وقت لگتا ہے۔ بس والدین میں حوصلہ اور صبر ہونا چاہیے۔ چاہے فوری طور پر نتائج برآمد نہ ہوں مگر بعد میں جا کر پتہ چلتا ہے کہ بچپن کی تعلیم و تربیت ایک لونگ ٹرم انوسٹمنٹ ہے۔ بچپن میں بچوں پر کئی گئی محنت اکارت نہیں جاتی۔

آج پھر وردہ کا فون آ گیا اور کہنے لگی ''ممی جلدی سے مجھے بتایئے کہ مجھے اپنے مریض کو بتانا ہے کہ ''He has cancer growth in his brain، میں اردو میں

اسے کیسے کہوں گی۔'' سدرہ نے اسے کہا کہ وہ کوشش کر کے بتائے کہ اس کی اردو کیا ہونی چاہیے۔ وردہ نے سوچ سوچ کر بتایا کہ میں کہوں گی ''انکل جی آپ کے سر پر کینسر اگ رہا ہے۔'' سدرہ بیٹی کی بات سن کر زور سے ہنس پڑی کہ ''تم کینسر اگ رہا ہے تو ایسے کہہ رہی جو جیسے اس کے سر پر کوئی درخت اگ رہا ہے۔'' بس اسی طرح کی باتوں میں وقت گزر رہا تھا۔

سدرہ کو بچے بڑے ہو جانے کے بعد فرصت ہی فرصت تھی۔ اب وہ ایک ہی طرح کے لگے بندھے روٹین سے بوریت محسوس کرنے لگی تھی۔ کامران اپنی کتابوں یا پھر اسپورٹس، چینل میں ڈوبے رہتے۔ اور وہ ساری شام ادھر ادھر فون پر گپیں ہانک کر گزار دیتی۔

ایک دن کامران نے اسے مشورہ دیا کہ ''وہ کوئی پارٹ ٹائم جاب کیوں نہیں تلاش کر لیتی۔ کم از کم دن کے چند گھنٹے تو مصروفیت میں گزریں گے۔'' وگرنہ دونوں بیٹیوں کے بڑا ہو جانے کے بعد اب گھر میں کام ہی کیا رہ گیا تھا۔ صفائی، ستھرائی آئرنگ تو انگریز کلینر کر جاتی تھی۔ ایسے میں سوائے کچن کے تھوڑے سے کام کے کرنے کے لیے اور کیا تھا وہ سوچتی ـ ـ ـ

سدرہ کو کامران کی تجویز کچھ اچھی لگی تو وہ اگلے ہی دن جاب سینٹر جا پہنچی۔ ایک دفتر میں فائلنگ کلرک کی اسامی خالی تھی۔ انٹرویو اچھا رہا اور انہوں نے اسے ہفتے میں اٹھارہ گھنٹے کام کی ملازمت پر رکھ لیا۔ کام پر زیادہ تر انگریز لوگ تھے۔ چند ایک ایشیائی بھائی بند تھے۔ سب انگریزی میں ہی بات چیت کرتے۔ سدرہ کا تو منہ دکھ جاتا انگریزی بولتے بولتے۔ اس کا بہت دل چاہتا کہ وہ اپنی مادری زبان میں دوسرے

ایشیائی لوگوں سے بات چیت کرے مگر سب جیسے جھجکتے تھے اپنی زبان میں بات کرنے سے۔۔۔سدرہ نے گاہے بگاہے دوسرے ایشیائی کولیگز سے اردو میں بات کرنا شروع کردی۔اس کا انگریز سپروائزر اکثر اسے اردو میں بات چیت کرتے وقت گھور گھور کر دیکھتا مگر وہ اسے نظرانداز کردیتی۔ایک دن جبکہ وہ دوسری ایشین کولیگ سے ہنس ہنس کر کینٹین میں اردو میں باتیں کر رہی تھی تو انگریز سپروائزر کے صبر کا پیمانہ جیسے لبریز سا ہوگیا۔

"Stop speaking Garbage."

اس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

سدرہ کو یوں لگا جیسے کسی نے اسے عرش سے اٹھا کر فرش پر پھینک دیا ہو۔اس کے اندر کوئی چیز۔۔۔ٹوٹ سی گئی۔۔۔اس دن کے بعد سے اس نے کچرا اٹھانے والی گاڑی کو پھر کبھی بھی نظر بھر کر نہیں دیکھا۔۔۔۔!



شادی ڈاٹ کوم
(Shadi.com)

کئی مہینوں کی سوچ بچار اور منصوبہ بندی کے بعد مسز شاہ نے آج شہر کے ایک شاندار ہوٹل میں میرج انٹروڈکشن ایونٹ کا اہتمام کیا تھا۔ اس تقریب کی خاص پبلسٹی مقامی ریڈیو، نیشنل نیوز پیپرز اور انٹرنیٹ پر کی گئی تھی اس لیے لوگ برطانیہ بھر سے جوق در جوق تقریب میں شرکت کرنے کے لیے اپنے نوجوان بچوں کے ہمراہ آ رہے تھے گویا ایک میلے کا سا سماں تھا۔ زرق برق لباس۔ جیولری، میک اپ، نئے نئے ہیر اسٹائل، گویا رنگ و بو کا ایک سیلاب سا امڈ آیا ہو۔

میں مسز شاہ کے ساتھ کئی مہینوں سے اس تقریب کے انتظامات اور انہیں عملی شکل دینے کے کام میں مصروف تھی۔ ہماری پوری کوشش تھی کہ تقریب کامیاب ہوتا کہ یہاں کی ایشیائی مسلمان کمیونٹی کو اپنے بچوں کے شادی بیاہ کے معاملات طے کرنے کے لیے کوئی مناسب پلیٹ فارم مہیا ہو سکے۔ میٹنگ کا انتظام دو لیولز پر کیا گیا تھا۔ ''ایک سیکشن میں تو صرف فیملز بیٹھیں گی اور دوسرے سیکشن میں ڈنر کے بعد صرف لڑکے لڑکیاں ہی جائیں گے تاکہ وہ اپنے والدین کی غیر موجودگی میں آپس میں گھل مل کر بات چیت کر سکیں۔'' مسز شاہ نے کہا کھانے کا انتظام بفے کی شکل میں کیا گیا تھا۔ تھری کورس میل تھا

تقریباً دو بجے تک تمام مہمان کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔لوگ آپس میں خوش گپیوں میں مشغول تھے اور نیٹ ورکنگ ٹائم کا پورا پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔

میری اور مدیحہ کی ڈیوٹی ہر ٹیبل پر جا کر لوگوں سے ہیلو ہائے کرنا اور تقریب کے بارے میں ان کی رائے جاننا تھا۔

مسز رحمان شہر کی ایک معروف سماجی کارکن تھیں۔ ان کے اپنے بچوں کی تو شادیاں ہو چکی تھیں۔ غالباً کسی فیملی کو ساتھ لے کر آئی ہوئی تھیں۔ ''بھئی شادی تو بور کے لڈو ہیں۔ جو کھائے وہ بھی پچھتائے اور جو نہ کھائے۔۔۔ وہ زیادہ پچھتائے۔'' مسز رحمان کہہ رہی تھیں۔ ان کی بات مسز اویس نے آگے بڑھاتے ہوئے کہا''تو پھر کیوں ناں بندہ لڈو کھا کر ہی پچھتائے۔'' اور اس کے ساتھ ہی ان کے ٹیبل پر زبردست قہقہہ پڑا۔

دوسرے ٹیبل پر اریجنڈ شادیوں پر گرما گرم بحث ہو رہی تھی۔ ایک خاتون کافی شاکی لگ رہی تھیں کہ اس ملک میں انگریزوں نے اریجنڈ شادیوں کی نیگیٹو پبلسٹی کر کے انہیں فورسڈ میرج بنا دیا ہے۔ حالانکہ اریجنڈ میرج میں کوئی ایسی قباحت نہیں ہے بلکہ کسی زمانے میں تو اس ملک کے شرفاء میں بچوں کی شادیاں اریجنڈ ہی ہوا کرتی تھیں۔ اس لیے کہ شادی صرف لڑکے لڑکی کا نجی معاملہ نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ دو خاندانوں کا ملن تھا۔''

ان کی بات کے جواب میں دوسری خاتون نے منہ کھولا۔ میں آپ کی بات سے سو فیصد اتفاق کرتی ہوں کیونکہ جیسے ہی اس زمانے کے انگریز گھرانوں میں لڑکیاں شادی کی عمر کو پہنچتی۔ والدین انہیں سجا بنا کر تقریبات میں ساتھ لے کر آتے تھے تا کہ

لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کو دیکھ کر اپنی پسند بتا سکیں۔ مگر اب تو یہاں کی سوسائٹی کا تار پود ہی بگڑ گیا ہے۔ شادیوں سے زیادہ تو طلاقیں ہو رہی ہیں اس لیے اب اکثریت تو شادی کے بغیر ہی رہنے کو ترجیح دے رہی ہے۔ جب جی چاہا۔ کپڑے سمیٹے اور چل دیئے۔ کوئی لمبا چوڑا بکھیڑا پالنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔''

پہلے والی خاتون پھر گویا ہوئیں ''بھئی اب اپنے لوگوں میں بھی شادیاں کہاں کامیاب ہو رہی ہیں۔ پہلے کہا کرتے تھے چٹ منگنی پٹ بیاہ مگر اب تو چٹ شادی پٹ طلاق۔ محاورہ ہی بدل گیا ہے۔ کئی ایک شادیوں سے واپس آ کر تو ابھی کپڑے بھی ڈھنگ سے نہیں سمیٹ پائے تھے کہ دو ہی ہفتوں میں علیحدگی ہوگئی بلکہ ہنی مون پر ہی دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔ اور چند ہفتوں کے اندر معاملہ ختم۔'' ''خدا کی پناہ'' دوسری عورت نے لقمہ دیا۔ ''سب قیامت کے آثار ہیں۔ اسلام سے دوری کا نتیجہ ہے۔ بچوں کی تربیت ہی صحیح ڈھنگ سے نہیں ہو رہی ہے۔'' خاتون مسلسل دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھی۔ ہم نے تو وہاں سے کھسکنے میں ہی عاقبت سمجھی کہیں ان خاتون کے زوردار لیکچر سے لوگ شادیوں سے ہی متنفر نہ ہو جائیں اور ہماری تقریب دھری کی دھری رہ جائے۔

ایک کونے میں کھڑی چند خواتین اپنے اپنے ملکوں کی یاد تازہ کر رہی تھیں کہ انڈیا اور پاکستان میں کس طرح رشتہ کرانے والیاں گھر گھر کی خبر رکھتی تھیں۔ جہاں کہیں بچے بچیوں نے ذرا سر اٹھایا بی اماں فوراً پہنچ جاتیں شادی کا پیغام لے کر۔ ان وقتوں میں ادب آداب اور رکھ رکھاؤ تھا۔ آنکھ میں شرم تھی۔ باپ دادا کی عزت کا لحاظ ہوتا تھا۔ ماں باپ نے جہاں مناسب گھرانہ دیکھ کر بات چیت پکی کر دی۔ وہیں خاموشی سے سر جھکا دیا۔

ڈاکٹر رابعہ کافی دیر سے خاموشی سے ان خواتین کی گفتگو سن رہی تھیں۔ ''ہم بچیوں کی تعلیم وتربیت پر تو بہت زور دیتے ہیں مگر لڑکوں کو بے لگام چھوڑ دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ لڑکیاں ذہنی طور پر لڑکوں سے بہت آگے نکل گئی ہیں۔ تعلیم کے میدان میں بھی کسی سے پیچھے نہیں مگر لڑکے ابھی تک روایتی ذہن رکھتے ہیں۔ چاہتے تو ہیں کہ بیوی پڑھی لکھی ہو۔ پروفیشنل بھی ہو مگر اس کے ساتھ ہی امور خانہ داری میں ماہر۔ میاں کے گھر آنے سے پہلے ہی گرم گرم کھانا پکا کر کلیوں کے گجرے سجا کر ادائے دلربائی سے دروازے پر استقبال کے لیے تیار کھڑی ہو۔ مگر اب یہ سب ہوتا نظر نہیں آتا۔'' وہ کافی غصے میں نظر آ رہی تھیں۔ دراصل کچھ ہی عرصہ پہلے ان کی ڈاکٹر بیٹی کی شادی اسی قسم کے چکر میں ٹوٹ گئی تھی جس کی تلخی کی بازگشت ان کی باتوں میں صاف سنائی دے رہی تھی۔

''مسز خان کب سے اپنے بیٹے کے لیے رشتہ دیکھ رہی ہیں۔ ہر گھر میں جھانک چکی ہیں۔ اب تو لوگ ان کے نام سے ہی کتراتے ہیں۔ جہاں جاتی ہیں واپس آ کر لڑکی والوں میں سو کیڑے نکالتی ہیں۔'' بیگم الطاف کہہ رہی تھیں۔ ''اسی لیے تو بیٹا تیس کے پیٹے میں چلا گیا ہے مگر رشتہ ہونے کی ابھی بھی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ان کے تو مزاج ہی نہیں ملتے۔ کبھی تو کہتی ہیں کہ پروفیشنل لڑکی چاہیے اور کبھی ہاؤس وائف کی رٹ لگا دیتی ہیں۔''

اب اس ٹیبل پر بحث پروفیشنل اور ہاؤس وائف کے گرد گھومنے لگی۔ ''بھئی یہ ہاؤس وائف آخر کیا چیز ہے؟ ہم نے بھی زندگی بھر ملازمت کی ہے اور گھر بھی چلایا ہے۔ آج کی عورت اپنے دونوں محاذ اچھی طرح سے سنبھالنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔'' ڈاکٹر رابعہ نے لقمہ دیا ''بھئی بہت سی ماؤں کا خیال ہے کہ لڑکی تعلیم یافتہ ضرور ہو کیونکہ بیٹے کی ڈیمانڈ یہی ہے مگر صرف گھر کی ہو کر رہ جائے۔ بس اس کو وہ ہاؤس

وائف کہہ رہی ہیں کہ ملازمت کے چکر میں نہ پڑے۔'' اب کی بار مسز ملک نے زبان کھولی ''آخر اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیوں کے اپنے بھی کچھ خواب ہوتے ہیں۔ اتنی تعلیم حاصل کر کے اسے چولہے کی نذر تو کرنے سے وہ رہیں۔ اگر وہ گھر اور کیرئیر کی ذمہ داریاں بخوبی نبھا سکتی ہیں تو پابندیاں لگانے کی تو ضرورت نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے لڑکیاں روایتی سوچ رکھنے والے گھرانوں میں شادی کرنے سے کترا رہی ہیں جہاں لڑکے کی بجائے ساس کے اصولوں کے مطابق زندگی گزارنا پڑے۔''

ذرا آگے بڑھے تو چند اور خواتین محوِ گفتگو نظر آئیں۔ ''ارے یہ مسز افتخار یہاں کیا کر رہی ہیں۔'' مدیحہ نے چونک کر پوچھا۔ ''ان کا تو ایک ہی بیٹا ہے اور پچھلے سال تو یہ شادی پاکستان سے کر کے لائی ہیں۔ اس قدر پیاری بہو ہے ان کو۔ بڑی ہی بااخلاق اور سلجھی ہوئی لڑکی ہے۔'' مسز افتخار ایک دوسری عورت سے کہہ رہی تھیں ''ایک ہی بیٹا ہے، ہماری تو قسمت ہی پھوٹ گئی ہے۔ بہو اچھی نہیں ملی۔ بس بات ختم ہو رہی ہے۔۔۔ مدیحہ حیران تھی کہ ابھی کل ہی تو یہ اپنی بہو کے ساتھ برٹش ہوم اسٹور میں ملی تھیں اور آج یہاں بیٹے کے لیے دوسری بیوی تلاش کرنے آگئی ہیں؟ میں نے گرہ لگائی اس کو کہتے ہیں Thinking Ahead۔ اور ہم آگے چل دیں۔

اگلی ٹیبل پر مسز مرزا کچھ خواتین کو گھیرے بیٹھی تھیں اور آج کے ایونٹ کی تعریف کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے تین ڈاکٹر بیٹوں کی تعریفیں کرتے نہ تھکتی تھیں۔ ''مجھے تو بس ڈاکٹر بہوئیں ہی چاہئیں۔ سرو قد، خوبصورت، نازک اندام، کھاتے پیتے گھرانے سے ہوں۔'' ''ارے یہ تو ظاہر کی بات ہو گئی مگر اصل آدمی تو اپنے کردار، تربیت، سوچ، انداز فکر اور صحیح قدروں سے ہی بنتا ہے۔ اس کے بارے میں آپ نے کبھی کچھ نہیں کہا۔'' ایک دوسری خاتون نے چبھتا ہوا سوال کر دیا، تو نیم خواندہ مسز مرزا نے انہیں گھور کر دیکھا کہ شاید ان کے کم پڑھی لکھی ہونے کا وہ مذاق اڑا رہی تھیں۔ انہوں

نے اس کی بات کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا یا شاید اس خاتون کی اتنی سنجیدہ بات کا مسز مرزا کے پاس جواب ہی نہیں تھا۔ جن کا سارا زور ظاہری رکھ رکھاؤ۔ ٹیپ ٹاپ اور اسٹیٹس پر تھا۔

میں اور مدیحہ ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگیں کہ کیسی کیسی چیزیں اللہ میاں نے بنا کر اس زمین پر پھینک دی ہیں۔ اب یہ تین ڈاکٹر بیٹوں کو ماں آئیڈیکل ڈاکٹر بہوؤں کی تلاش میں زمین آسمان ایک کر دے گی۔ کتنی ہی لڑکیوں کو بلاوجہ ریجکٹ کرے گی۔ کتنوں کے دل توڑے گی۔ کتنوں کی بددعائیں سمیٹے گی۔ اور اگر کوئی ان کے بیٹوں سے پوچھے کہ انہیں ڈاکٹر بیویاں ہی چاہیے تو ایمان سے کہتی ہوں وہ کہیں گے یہ صرف اماں کی خواہش ہے ورگرنہ ہم تو ایک ایسی لڑکی کے خواہش مند ہیں جو صحیح معنوں میں ایک اچھی لائف پارٹنر ثابت ہو سکے۔ بس تعلیم یافتہ ضرور ہو۔

نیٹ ورکنگ پورے عروج پر تھی۔ مسز شاہ بہت ایکسائٹڈ تھیں اور ہر ایک ٹیبل پر جا کر لوگوں سے خوش گپیوں میں مصروف تھیں کہ اتنے میں مائیک پر آواز گونجی کہ ''شادی کے امیدوار سب لڑکے لڑکیاں ہال کے دوسرے کونے میں مخصوص نشستوں پر تشریف لے جائیں۔'' اعلان سن کر بیٹوں کی ماؤں کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ جیسے ہی لڑکے لڑکیاں مخصوص کونے کی طرف بڑھے۔ سب مائیں چوکنا ہو کر ایک دوسرے کو تکنے لگیں اور منتظمین کے ہزار منع کرنے کے باوجود بچوں کے گرد جمگھٹا بنا کر کھڑی ہو گئیں اور وہاں سے کسی طرح ٹل ہی نہیں رہی تھیں۔ بیٹا اگر کسی لڑکی سے بات کرنے کے لیے آگے بڑھتا تو فوراً اماں آنکھ، ناک اور سر ہلا کے اشارے سے بیٹے کو منع کر دیتیں۔

میں اور مدیحہ سارا تماشہ کافی دیر سے دیکھ رہے تھے۔ ''اس طرح تو لڑکوں کی

شادیاں نہیں ہوں گی جو حرکتیں یہ مائیں کر رہی ہیں۔'' مدیحہ نے غصے سے کہا۔ ''دراصل وہ چاہتی ہی نہیں ہیں کہ بیٹا جی خود لڑکی پسند کریں۔ وہ پہلے لڑکی خود پسند کرنا چاہتی ہیں اور چاہیں گی کہ بیٹا بھی اسی لڑکی کو پسند کرے۔'' جبھی تو آنکھ، کان، ناک کے اشارے کر رہی ہیں۔'' میں نے کہا ''تو یہ سارا ڈرامہ رچانے کی کیا ضرورت ہے کہ بیٹے کی پسند کی لڑکی ڈھونڈھ رہی ہوں۔ پھر یہ کہنا کہ اسے کوئی لڑکی ہی پسند نہیں آتی۔ سراسر بکواس ہے۔ دراصل ماں کو ہی لڑکی پسند نہیں آتی اور بیٹا کاٹھ کے اُلو کی طرح پیچھے پیچھے پھرتا رہتا ہے۔'' مدیحہ جل کر بولی۔ ''آجکل کی لڑکیاں اسی قسم کے لڑکوں سے تو الرجک ہیں۔ جن کے اپنے کوئی ذہن ہی نہیں ہیں اور اماں کا پلو پکڑ کر چل رہے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

ہال اب آہستہ آہستہ خالی ہونے لگا تھا۔ لوگ آپس میں ٹیلی فون اور ای میلز ادل بدل کر رہے تھے کہ اتنے میں مسز مرزا پاس سے گزریں جو کسی دوسری خاتون سے کہہ رہی تھیں۔ ''بس سوشل ایونٹ ہی تھا، کھانا بھی ٹھیک تھا مگر لڑکی کوئی ہماری پسند۔۔۔! اس سے تو شادی ڈاٹ کوم ہی بہتر ہے کہ گھر بیٹھے بٹھائے بیسیوں رشتے دیکھ لو۔ اور وقت کی لمبی بچت۔۔۔ میں اور مدیحہ ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھنے لگیں۔۔۔! کہ ایسی منافقت۔۔۔! ایسا دوغلہ پن۔۔۔!

○

ریورس گیئر
(Reverse Gear)

روپا کو اس پراسرار سی کائنات اور اس پر بسنے والے انسانوں کے بارے میں جاننے میں بچپن سے ہی بہت دل چسپی تھی۔ اس لیے اسے پامسٹری، ٹاروکارڈز۔ علم حروف اور علمِ نجوم کے بارے میں جہاں کہیں کوئی مواد نظر آجاتا اسے پڑھے بغیر چین سے نہیں بیٹھتی تھی۔ ہر سال بڑے اہتمام سے نئے سال کے لیے ہاروسکوپ کی کتاب خرید کر دیکھتی کہ آنے والے سال کی پیشن گوئیاں کیا تھیں۔ اخباروں رسالوں میں چھپنے والے ''آپ کا ہفتہ کیسا ہوگا۔'' کے صفحات ہمیشہ اس کی دل چسپی کا مرکز ہوتے مگر یہ الگ بات تھی کہ پڑھنے کے فوراً ہی بعد سب اس کے ذہن سے محو ہو جاتا گویا اسے صرف پڑھنے کی حد تک دل چسپی تھی مگر عمل کا خانہ خالی ہی تھا۔

میں اکثر اس کی اس عادت سے چڑ جاتی تھی ''کیا تم ہر وقت برجوں اور ستاروں کے چکر میں پڑی رہتی ہو۔'' تو وہ ہنس کر جواب دیتی کہ ''یار بس ذرا انٹرسٹنگ ہے اس میں کیا ہرج ہے ہم کون اس پر عمل کرنے جا رہے ہیں۔ ویسے تم اگر تھوڑا بہت علم نجوم کے بارے میں جان لو تو کوئی نقصان نہیں ہو جائے گا۔ کریکٹر ریڈنگ تو ہمیشہ بڑی زبردست ہوتی ہے ان کتابوں میں۔ کم از کم لوگوں کی شخصیت بارے میں کچھ

معلومات ہی مل جاتی ہیں۔"

آج کالج میں پورے دو پیریڈز فری تھے اور میری شامت آ گئی تھی کیونکہ روپا کہیں سے علم نجوم کی دو موٹی موٹی کتابیں اٹھا لائی تھی گویا آج اس نے علم نجوم پر مجھے لیکچر دینے کا پورا پورا پروگرام بنا رکھا تھا۔

میں اگر اسے کہتی کہ یہ میرے مذہب کے خلاف ہے کہ ہم مستقبل کا حال جانتے پھریں تو وہ تنک کر کہتی کہ "مذہبی نقطہ نظر سے علم نجوم نہ تو مذہب کا حصہ ہے اور نہ ہی عقیدہ۔۔۔ فقط حساب کا ایک قاعدہ ہے۔ جیسے ہر شخص واچ دیکھ کر ٹائم بتا سکتا ہے۔ اسی طرح ستاروں کا حساب دیکھ کر یہ بتایا جا سکتا ہے کہ کون سا ستارہ کس برج میں ہے۔ اور اس وقت دنیا پر اپنے کیسے اثرات چھوڑ رہا ہے۔" وہ بالکل جوتشیوں کے سے انداز میں مجھے قائل کرنے کی کوشش کرتی۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے وہ بولی کہ "ستارے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک سٹیشنری یعنی جامد اور دوسرے جو اپنے محور اور دوسرے ستاروں کے گرد گھومتے ہیں البتہ جامد ستاروں کے گرد گھومنے والے ستاروں نے اپنے ایسے مقام بنائے ہوئے ہیں جنہیں علم نجوم میں برج کہا جاتا ہے۔ اور کل بارہ برج ہیں۔ کچھ پتہ چلا تمہیں میڈم۔۔۔" روپا نے اپنے علم کا روپ جھاڑتے ہوئے کہا۔

میں روپا کی ستاروں کے بارے میں اویرنس سے کچھ مرعوب سی ہو گئی تھی اور اس بارے میں کچھ مزید جاننے کی خواہش میرے اندر انگڑائیاں لینے لگی تھی۔

"اچھا چلو بولو کیا کہتے ہیں تمہارے برج۔" میں نے قدرے لاپرواہی سے کہا۔

تو روپا تو بس ایسی رواں ہوئی کہ وہ کہے اور سنا کرے کوئی۔۔۔ "ہاں تو میں بتا رہی تھی

کہ کل بارہ برج ہوتے ہیں۔اوران کے مختلف نام ہیں۔ ہر برج ایک نہ ایک ستارہ کی ملکیت ہوتا ہے یعنی کوئی نہ کوئی اس کا حاکم یعنی رولنگ پلینٹ ہوتا ہے اور یہی برج انسانوں کی طرح آپس میں دوستی اور دشمنی بھی رکھتے ہیں۔'' علم نجوم میں میری دلچسپی بڑھتی جارہی تھی اور میں نے منہ سے کچھ کہے بغیر ہی روپا کی طرف پرشوق نگاہوں سے دیکھا تو وہ بغیر رکے کہنے لگی'' ہرایرہ غیرہ نتھو خیرہ قسمت کا حال نہیں بتا سکتا۔اس کے لیے علم نجوم سے پوری طرح واقفیت بے حد ضروری ہے کہ ایسے شخص کو برجوں اور ستاروں کے چکر کا علم پوری طرح آتا ہواور اگر اس کا علم ادھورااور ناقص ہوگا تو خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔'' وہ اپنی ہی لہر میں بولے چلی جارہی تھی۔

میں نے بے صبری سے پوچھا'' برجوں اور ستاروں کے بارے میں کچھ اور بھی کہو گی کہ نہیں میڈم جوتشی'' تو وہ زیرلب مسکرا کر گویا ہوئی'' کل بارہ برج ہیں جن میں حوت، حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، دلو اور جدی ہیں۔ آسمان میں گھومنے والے سات ستارے ہیں۔اور دو ستارے ان کے امدادی یعنی ہیلپرز ہیں۔ان ستاروں میں سورج، قمر، مریخ، زحل، مشتری، عطارد، اور زہرہ ہیں جبکہ امدادی ستارے یورنیس اور نیپ چون ہیں اور ان تمام ستاروں اور برجوں کے یونانی زبان میں مختلف نشانات یعنی سمبل دیئے گئے ہیں۔'' ''How Interesting''۔۔۔ میں اپنے ذوقِ جستجو کو مزید نہ چھپا سکی تو روپا خوش ہو کر بولی۔'' اب آئی ہو ناں سیدھی راہ پر میڈیم۔۔۔'' بالکل جیسے ہم میں لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں اسی طرح ستاروں کی بھی دشمنیاں اور دوستیاں ہوتی ہیں۔'' '' اچھا تو بتاؤ کہ ہمارے ستاروں میں آپس میں دشمنی ہے کہ دوستی۔'' میں نے بے صبری سے پوچھا۔

روپا میری بات سن کر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''خاک دوستی ہوگی ہر وقت تو تکرار ہوتی رہتی ہے۔ پھر بھی بتاتی ہوں۔ تمہارا برج جوزا ہے اور تمہارا حاکم ستارہ عطارد ہے۔ اور اس کے دوست ستارے قمر، زحل اور زہرہ ہیں۔ مریخ اور مشتری اس کے پکے دشمن۔ جبکہ سورج نہ اس کا دوست ہے نہ دشمن۔'' میں نے جلدی سے لقمہ دیا روپا تمہارا ستارہ ضرور سورج ہی ہوگا کیونکہ کبھی تو تم بڑی دوستی بھگارتی ہو اور کبھی جانی دشمن نظر آتی ہو۔'' ''نہیں میڈم میرا ستارہ زہرہ ہے۔ دوست ہوں تمہاری بیوقوف لڑکی۔'' اس نے جل کر کہا۔ بس تمہارا لیکچر پورا ہو گیا یا ابھی کچھ اور باقی ہے۔'' میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا تو روپا بے صبری سے بولی۔ ''ارے نہیں بھئی۔ ابھی تو بہت کچھ ہے بتانے لائق۔۔۔ جانا مت۔'' وہ التجا کرتے ہوئے بولی۔

''ان ستاروں کی رنگت بھی الگ الگ ہوتی ہے۔ جیسے سورج، سرخ اور قمر سفید ہوتا ہے۔ زہرہ سفید سیاہی مائل تو مریخ سرخ۔ مشتری پیلے رنگ کا جبکہ عطارد سبز اور زحل جیٹ بلیک'' ''اوہو تو جبھی کہوں یہ سفید رنگت ہر وقت دھواں دھواں سی کیوں رہتی ہے۔ تمہاری زہرہ کی بچی۔۔۔ میں نے طنزاً کہا تو روپا کہاں پیچھے رونے والی تھی فوراً بولی اور تم عطارد کی اولاد ساون کے اندھے کی طرح تمہیں ہر طرف ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے۔'' اس نے سبز رنگ پر بھرپور وار کیا۔ تو میں بجائے غصے میں آنے کے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''اور سنو میڈم ستارے مذکر اور مونث بھی ہوتے ہیں۔ ان کی نحوست بھی ہوتی ہے اور یہ الٹی چال بھی چلتے ہیں۔'' روپا نے مزید علمیت بھگارتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا ستارہ تو مذکر ہی ہوگا روپا جو ہر وقت جوشیلے مردوں کی طرح لڑائی جھگڑے پر آمادہ رہتی ہو۔'' میں نے گویا اس کا مذاق اڑایا تو روپا تنک کر بولی ''نہیں زہرہ مونث

ستارہ ہے۔یعنی خالص فیمنسٹ اور عطارد مخنث ہے یعنی نہ مرد نہ عورت۔بس دونوں کے درمیان کی کوئی چیز ہے میرے بجائے تم اپنی فکر کرو جان من۔" روپا نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔" یہ کیا بیہودگی ہے میں نے قدرے غصے سے کہا،تم بکواس کر رہی ہو۔"قسم لے لوایسا ہی لکھا ہے کتاب میں۔لودیکھ لو۔" اس نے کتاب میرے آگے کرتے ہوئے کہا۔

مجھے کوئی کتاب نہیں دیکھنی ہے یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ" ہر عوت کے اندر کچھ مرد اور ہر مرد کے اندر کچھ عورت ہوتی ہے تو تمہارا ستارہ کونسی نئی بات بتا رہا ہے۔ افلاطون کی اولاد۔۔۔" اسی بحث وتکرار میں کافی وقت گزر چکا تھا۔ میں نے تقریبا اٹھتے ہوئے کہا کہ" بس اب اگلا پیریڈ شروع ہونے والا ہے۔چلتے ہیں،آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔"

روپا نے جلدی سے میرا ہاتھ پکڑ کر گویا اٹھنے سے منع کر دیا۔" اب کیا ہے۔" میں ذرا جز بز ہو کر بولی۔" مگر سب سے زیادہ دل چسپ بات ستاروں کے بارے میں تو تم نے سنی ہی نہیں۔" "اب وہ کیا ہے۔جلدی سے بتادو۔" میں نے بے صبری سے کہا۔

" ذرا دم تو لو۔غور سے سننے والی بات ہے میڈم۔ستارے سیدھی اور الٹی چال بھی چلتے ہیں۔جب سیدھے جا رہے ہوں تو ایسی حالت کو مستقیم یعنی صراط مستقیم کہتے ہیں جیسے تم چلتی ہو۔اسے ہندی زبان میں مارگی کہا جاتا ہے۔مگر جب کوئی دوسرا ستارہ اپنی کشش سے سیدھی چال والے ستارے کو اپنی طرف کھینچتا ہے تو اس کی چال الٹ ہو جاتی ہے۔ جسے اردو میں رجعت، ہندی میں وکری اور انگریزی میں ریٹروگریڈ موومنٹ کہتے ہیں۔جیسے گاڑی ریورس گیئر میں جاتی ہے۔""" اچھا تو تم ہو

وہ الٹی چال والا ستارہ جو مجھ جیسی سیدھی سی لڑکی کو اپنی کشش سے الٹا سیدھا کرتی رہتی ہو۔'' میں نے مذاقاً کہا تو روپا برا سا مان گئی۔

''ارے سوائے چاند اور سورج کے باقی سب ستارے الٹی سیدھی چال ہی چلتے ہیں۔ اس لیے تمہارے ستارے کی کشش مجھے بھی الٹی سیدھی کرتی رہتی ہے۔ صرف میں ہی مجرم نہیں ہوں۔ تم بھی برابر کی شریک ہو۔'' روپا نے گویا بدلہ لیتے ہوئے کہا تو ہم دونوں نے ہی زبردست قہقہہ لگا دیا۔ ''اچھا تو اب چلو۔ پیریڈ تو مِس ہو گیا۔ گھر جلدی پہنچنا ہے ورنہ اماں میری چال الٹی کر دیں گی۔'' یہ کہہ کر میں تو وہاں سے گیٹ کی طرف بھاگی جہاں طارق بھیا نہ جانے کب سے گاڑی لیے میرا انتظار کر رہے تھے اور میں علم نجوم کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھی۔

آج سڑک پر ٹریفک کا رش معمول سے کچھ زیادہ ہی تھا کیونکہ ایسٹر کی چھٹیوں کے لیے آج سکولوں کا آخری دن تھا اور حد نظر تک سڑک پر گاڑیوں کی طویل قطاریں نظر آ رہی تھیں۔ بھیا اپنی نئی نویلی دھان پان سی اسپورٹس منی کوپر بڑے اسٹائل سے چلا رہے تھے جبکہ مجھے اتنی ٹریفک سے سخت وحشت ہو رہی تھی کیونکہ اماں نے آج گھر جلدی آنے کے لیے کہا تھا۔ ''پہلے تو روپا کی بچی کے ستاروں اور برجوں نے سارا وقت لے لیا اور اب ٹریفک نے گویا رینگنے کی قسم کھا رکھی تھی۔'' میں منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ یونہی چلتے رکتے ٹریفک ایک ڈھلوانی سڑک پر آ گئی۔ ہمارے بالکل آگے ایک بڑی سی لینڈ کروزر جا رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد مجھے یوں لگا جیسے وہ گاڑی آگے کی بجائے پیچھے کی طرف آ رہی ہے یعنی ریورس گیئر۔ میں نے جلدی سے بھیا کو خبردار کیا کہ ''صرف مجھے ہی ایسا لگ رہا ہے یا واقعی یہ گاڑی پیچھے کی طرف آ رہی ہے۔''

بھیا نے یکدم ہارن بجانا شروع کر دیا کیونکہ گاڑی واقعی پیچھے آ رہی تھی۔ خدا جانے کیا معاملہ تھا۔ آگے والا ڈرائیور نشے میں تھا یا اناڑی تھا کہ اتنے ہارن بجانے کے باوجود لینڈ کروزر نے بھیا کی نئی نویلی گاڑی کا حشر کر دیا گویا ستارے الٹی چال چل رہے تھے۔

بھیا غصے میں پھنکارتے ہوئے گاڑی سے باہر نکلے تو دوسری طرف لینڈ کروزر سے نکلنے والی ایک ادھیڑ عمر ایشین عورت تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اگر عورت کی بجائے ڈرائیور مرد ہوتا تو بھیا اس کی ایسی خبر لیتے کہ وہ زندگی بھر کے لیے ڈرائیونگ کرنا بھول جاتا۔ مگر بھیا نے دھیرج رکھتے ہوئے خاتون سے اس کی انشورنس کی تفصیلات طلب کیں تو وہ بحث پر اتر آئی کہ ”اس ملک میں ایسا کوئی قانون نہیں ہے کہ اگر میں ریورس گیئر میں کسی گاڑی کو ٹکر ماروں تو میں ہرجانہ بھروں۔“ اب تو بھیا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔ ایسی احمقانہ بات سن کر میری تو ہنسی ہی نکل گئی۔

یہ محترمہ کہاں رہ رہی ہیں۔ انگلینڈ یا چیچو کی ملیاں۔ اور جس قانون کا یہ ذکر کر رہی ہیں۔ شاید انہوں نے اپنی کچن کیبنٹ میں بنایا ہے۔ اب تو بھیا کا پارہ بہت اونچائی پر جا رہا تھا۔ ”قد سے بڑی گاڑی لے کر باہر نکلی ہو ڈرائیونگ تو سیکھ لینی تھی۔ اتنی ٹریفک میں تم ریورس گیئر کس خوشی میں لگا رہی تھیں کیا تمہیں نظر نہیں آ رہا تھا کہ پیچھے گاڑی ہے۔“ بھیا اسے بے نقط سنا رہے تھے۔ ”دراصل آپ کی گاڑی اتنی چھوٹی ہے کہ نظر ہی نہیں آئی۔“ عورت نے دلیل پیش کی۔ بجائے کسی قسم کی شرمندگی یا افسوس کے وہ عورت عجیب ڈھٹائی سے باتیں کر رہی تھی۔

بھیا نے مزید انتظار نہ کرتے ہوئے پولیس کو فون کرنا چاہا تو اس عورت نے

جھٹ سے پینترا بدل لیا۔ ''دراصل میرا خاوند ہی انشورنس کے کام کو ڈیل کرتا ہے۔ مجھے اپنی انشورنس کمپنی کا علم نہیں ہے۔ مگر گھر جا کر آپ کو فون کر کے بتا دوں گی۔'' بھیا نے اپنا وزٹنگ کارڈ اسے دیا تو وہ اسے پڑھتے پڑھتے چونک سی گئی۔ کنسلٹنٹ سائیکاٹرسٹ ''تو آپ پاگلوں کے ڈاکٹر ہیں۔ اور مجھے بھی پاگل سمجھ کر مجھ پر چلّا رہے ہیں۔ میں تو بس گاڑی کو ریورس گیئر میں ڈال کر ٹریفک میں سے نکلنا چاہ رہی تھی کہ آپ سے جا ٹکرائی۔

''مجھے پورا یقین ہے کہ تم ضرور کسی دماغی خلفشار کا شکار ہو ورنہ ایسی بیہودہ حرکت ٹریفک کے ایسے رش میں۔ کوئی سمجھ دار انسان نہیں کر سکتا۔'' بھیا دھاڑے۔۔۔ میں نے مسکراتے ہوئے سوچا کہ آج تو واقعی ستارے الٹی چال چل رہے ہیں ورنہ ایسی بھیڑ میں ریورس گیئر۔۔۔۔!



پاکی
(Paki)

”دلوں کے آئینے مختلف ہوتے ہیں۔ حادثات اور واقعات کے عکس ان میں ایک طرح نہیں اترتے۔“

لاریب کافی دیر سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس قول پر غور وفکر کر رہی تھی۔ چند سال قبل وقوع پذیر ہونے والا واقعہ اب بھی رہ رہ کر اسے کچوکے لگا رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے بھرے بازار میں اس کے سر سے چادر کھینچ کر اس کی روح تک کو برہنہ کر دیا ہو۔ بے بسی اور بے چارگی کے جان لیوا احساس نے اسے اتنے برسوں میں جیسے ادھ موا کر کے رکھ دیا تھا۔

کئی برسوں سے وہ اس علاقے میں رہائش پذیر تھے۔ کئی اور عزیز رشتہ دار بھی قرب وجوار میں آباد تھے۔ جس سے وطن سے دور ہونے کا احساس ہی نہ تھا۔ انگلینڈ آتے ہوئے اسے تقریباً چالیس برس ہونے کو آئے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ اب یہی اصل وطن ہے۔ پاکستان آنا جانا ویسے ہی بہت کم ہو گیا تھا۔ کیونکہ سب بہن بھائی اور دیگر قریبی عزیز اب وہاں سے امریکہ، کینیڈا، سپین، اٹلی سعودی عرب اور فار ایسٹ میں جا بسے تھے۔ ایسے میں اس کی ملاقات اگر کسی ایسے ہم وطن سے ہوتی جو حال ہی

میں اس ملک میں آئے ہوں اور خود کو تارکین وطن میں شمار کرتے تو لاریب کو بڑا عجیب سا لگتا کیونکہ اس نے خود کو کبھی تارکین وطن میں شمار ہی نہیں کیا تھا بلکہ یہاں کی شہریت حاصل کرنے کے بعد میاں بیوی یہیں پر اچھی سرکاری ملازمتوں پر فائز تھے۔ تینوں بچے بھی اب اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے عملی زندگی میں قدم رکھ چکے تھے۔ ہر طرف سکھ کی ہوائیں چل رہی تھیں کہ چند برس قبل وقوع پذیر ہونے والے اس واقعہ نے لاریب کی سوچ کا دھارا ہی بدل دیا۔

وہ شروع میں جس تین بیڈروم کے سیمی ڈیٹیچڈ گھر میں شفٹ ہوئے تھے۔ وہ کئی برس بعد ان کی ضرورتوں کے لیے ناکافی ہو گیا تو انہیں چار بیڈروم کے بڑے گھر کی تلاش ہوئی۔ تلاش بسیار کے بعد انہیں اس علاقے میں چند ایک سٹریٹس چھوڑ کر چار بیڈروم، تین رسپشن رومز اور کافی بڑے گارڈن والا گھر بہت پسند آ گیا۔ مگر گھر میں کچھ کام ہونے والا تھا ورنہ سپیس بہت تھی۔ بچے جیسے چاہتے اچھلتے کودتے، پرواہ نہیں تھی۔ بچوں کو تو تین اسٹوری گھر، تہہ خانہ، بڑا سا گارڈن بڑے بڑے کوریڈور سبھی بہت اچھے لگ رہے تھے کہ وہ وہاں اپنے دوستوں کے ساتھ خوب ہلا گلا کر سکتے تھے۔

''گارڈن پارٹیاں باؤنسی کاسل اور باربی کیو کا تو اپنا ہی مزہ ہے۔'' بڑے بیٹے شبلی نے خوش ہو کر کہا۔ اگر کوئی قباحت تھی تو ساتھ والا گھر، جو کہ نہایت خستہ حالت میں تھا۔ دونوں میاں بیوی کو فکر تھی کہ اگر ساتھ والا گھر اسی حالت میں رہا تو ان کی پراپرٹی کی مارکیٹ ویلیو بھی متاثر ہو گی۔ یہی سوچ کر وہ کچھ گومگو کی حالت میں تھے۔

ذرا تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ اس خستہ حال مکان میں ایک نوے سالہ بوڑھا انگریز اکیلا رہتا ہے۔ مکان کی دیکھ بھال کرنے کی اس میں سکت نہیں بس اس کا مسکن

تو نیچے کا ایک کمرہ ہے۔ وہی اس کی کل کائنات ہے۔ اوپر والے کمروں کی حالت خستہ تھی۔ بیڈ رومز میں کبوتروں نے گھونسلے بنا رکھے تھے اور ہر وقت غٹر غوں کی آوازیں کانوں کو چھیدتی رہتیں تھیں۔

مکان پر فائنل آفر دینے سے پہلے وہ دونوں میاں بیوی اس بوڑھے انگریز سے ملنے کے لیے گئے تا کہ اس کے مستقبل کے پروگرام کا کچھ پتہ چل سکے۔ بوڑھا انگریز بڑی خندہ پیشانی سے پیش آیا۔ اور بتانے لگا کہ ''جب یہ مکان آج سے سو سال قبل بنے تھے۔ تو اس کے والدین نے یہ گھر خریدا تھا۔ ان کی وفات کے بعد یہ گھر ترکے میں اسے ملا تھا۔ اب وہ چاہتا ہے کہ کسی اولڈ پیپلز ہوم میں چلا جائے مگر سمجھ میں نہیں آتا مکان کو کس طرح فروخت کرے کیونکہ ایسی حالت میں اسے خریدنے کو کوئی تیار نہ ہوگا۔''

لاریب نے بوڑھے انگریز سے پوچھا اگر وہ پسند کرے تو وہ اپنے اسٹیٹ ایجنٹ سے کہہ کر اس گھر کو بکوانے کی بات چیت کر سکتی ہے۔ بوڑھے ولیم نے اسے بخوشی اجازت دے دی اور چند ہی دنوں میں کسی پراپرٹی ڈیولپر نے یہ مکان خرید کر کسی اور کے پاس مزید منافع پر فروخت کر دیا۔ اس طرح چند مہینوں کے اندر اندر یہ مکان کئی بار فروخت ہوا۔ آخری بار یہ مکان ایک آئرش بلڈر نے خریدا اور مرمت وغیرہ کروا کر اسے کرایہ پر اٹھا دیا۔ اس دوران وہ اپنے نئے گھر میں شفٹ ہو چکے تھے۔ بظاہر تو ساتھ والے مکان کی حالت کافی بہتر ہو گئی تھی مگر ہر دوسرے تیسرے مہینے نئے کرائے دار آتے رہے اور صحیح معنوں میں یہ مکان اتنے برسوں میں کبھی گھر نہ بن سکا۔ خیر ہمارا کیا مسئلہ ہے۔ As long as ہمیں یہ آنے جانے والے

کرایہ دار کسی طرح کی تکلیف نہیں دیتے تو ٹھیک ہے۔ لاریب خود ہی سوال کرتی اور خود ہی جواب دے دیتی۔ مگر اس کا دل چاہتا تھا کہ پڑوس میں کوئی اچھے ہمسائے ہوں۔ ذرا میل جول رکھنا اچھا لگتا ہے۔ مگر ان حالات میں آنے جانے والوں سے کیا میل جول رکھا جا سکتا تھا۔

اب کی بار آنے والے کرایہ دار بے حد گھٹیا ثابت ہوئے۔ ان کے چار بچے جن میں دو تو ٹین ایجر تھے ان کے دوست ہر وقت فرنٹ روم اور پھر فرنٹ گارڈن میں ہنگامہ مچاتے رہتے۔ اکثر فرنٹ گارڈن کی فینس پر چڑھ کر بیٹھے رہتے۔ لاریب جب بھی کام سے واپس آتی ان سب کو اس طرح باہر پنکھ پھیلا کر بیٹھے دیکھ کر اس کا موڈ آف ہو جاتا۔ چند ایک مرتبہ دبی دبی زبان سے اس نے انہیں اس طرح بیٹھنے سے منع بھی کیا مگر وہ سنجیدگی سے اسکی بات کا نوٹس ہی نہ لیتے۔ ان کی انگریز ماں کبھی اسے نظر ہی نہ آتی تھی۔ بچوں کو چند مرتبہ کہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ حالات سدھرنے کی بجائے مزید بگڑ گئے جیسے بچوں کے ہاتھ کوئی تماشہ آ گیا ہو۔ اب وہ اکثر چیونگم کے ریپنگ پیپرز اور کرسپس کے خالی پیکٹ ان کے فرنٹ گاردن کی طرف اچھالتے رہتے۔

ایک دن تو حد ہی ہو گئی انہوں نے فرنٹ ڈور کے Keyhole میں چیونگم بھر دی جس سے لاریب کو دروازہ کھولنا مشکل ہو رہا تھا۔ اتنی سردی میں باہر کھڑے کھڑے اس کی قلفی جمی تو اسے بہت غصہ آیا۔ اس نے غصے میں پڑوسیوں کی کال بیل بجائی تو آج ان کی انگریز ماں نے دروازہ کھولا تو اس نے بتایا کہ وہ مقامی اسپتال میں نرس کا کام کرتی ہے۔ کیونکہ شفٹ ورک ہے اس لیے دن کے وقت وہ گھر پر نہیں ہوتی تا کہ دیکھ سکے کہ بچے اور ان کے دوست کیا کرتے رہے ہیں بہر حال وہ بچوں سے بات

کرے گی اور ان کے دوستوں کو بھی Fence پر چڑھ کر بیٹھنے اور ان کے گارڈن میں کاغذ پھینکنے سے منع کرے گی۔ لاریب نے سکھ کا سانس لیا کہ بچوں کی ماں تو کچھ معقول لگ رہی تھی۔ مگر صرف چند دن ہی خیریت سے گزرے پھر وہی شور وغوغا شروع ہوگیا۔

کبھی تو آدھی رات کو میوزک اس قدر اونچا لگاتے کہ سونا مشکل ہو جاتا تو کبھی لیٹ نائٹ ویکیوم کرنا شروع کر دیتے۔ عجیب مصیبت تھی۔ آخر کیا کیا جائے۔ دن کے وقت اکثر ڈاگ فوڈ باہر گارڈن میں پڑی رہتی۔ بڑی بڑی ہڈیاں اور گوشت جس پر مکھیاں بھنبھناتی رہتیں۔ سخت ناگوار قسم کی بو گھر کے قریب آتے ہی آنے لگتی۔ لاریب کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے تو اس نے انوائرنمنٹ ہیلتھ والوں سے شکایت کر دی کہ ان کا یہاں رہنا مشکل ہو رہا ہے۔ بس بات یہیں سے بگڑ گئی۔ انگریز پڑوسن کو اس بات پر غصہ تھا کہ ان کی شکایت کیوں کی گئی ہے۔۔ اگلے چند مہینے آن آف قسم کے حالات میں گزرے۔ کبھی تو قدرے سکون ہو جاتا اور کبھی پھر وہی شور شرابا۔۔ زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی تھی۔

ایک مرتبہ آدھی رات کو پڑوسن کی ٹین ایجر لڑکی اور اس کے ایشین بوائے فرینڈ میں جھگڑا ہو گیا تو اس نے اینٹ مار کر پڑوسن کی کھڑکی کا شیشہ توڑ ڈالا۔ لاریب اور عزیز بھاگ کر بیڈروم سے نیچے آئے کہ شاید ان کی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا ہے۔ مگر جیسے ہی فرنٹ ڈور کھول کر دیکھا۔ دو پولیس آفیسر لڑکی کے بوائے فرینڈ کو اریسٹ کر رہے تھے جبکہ وہ Resist کر رہا تھا۔ جس پر پولیس اسے فٹ پاتھ پر لٹا کر اس کی خوب دھنائی کر رہی تھی۔ عزیز کو ان پڑوسیوں پر اس قدر غصہ تھا کہ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ ان

سب حرامی لونڈوں کو پکڑ کر پولیس کے ساتھ مل کر ان کی خوب مرمت کرے۔

عزیز نے با آواز بلند کہا کہ ''اس کو چھترول کرو اچھی طرح سے۔'' میرے خیال میں پولیس والے عزیز کی بات سمجھ گئے اور بولے۔

''Don't worry we will sort him out.''

غرضیکہ آئے دن کوئی نہ کوئی ہنگامہ کھڑا کرتے رہتے لگتا تھا کہ They are neighbours from hell. گویا زندگی جہنم بن گئی تھی۔ اب دونوں میاں بیوی سنجیدگی سے یہاں سے شفٹ ہونے کے بارے میں سوچنے لگے کیونکہ ان سے روز روز کی بک بک برداشت نہیں ہوتی تھی۔ خوامخواہ کی ٹینشن لگی رہتی۔ کام سے گھر واپس آتے ہوئے یہی دھڑکا لگا رہتا کہ پتہ نہیں اب کونسی نئی مصیبت منہ کھولے کھڑی ہوگی۔

ایک مرتبہ تو حد ہی ہوگئی۔ آدھی رات کو اس قدر تیز میوزک بجا رہے تھے کہ سارا محلّہ ڈسٹرب ہو رہا تھا مگر سب سے زیادہ مسئلہ لاریب کو ہو رہا تھا کہ ان کا گھر سب سے زیادہ قریب تھا بلکہ ایک طرف کی دیواریں بھی ملی ہوئیں تھیں۔

چھوٹی بیٹی کے جی سی ایس سی کے ایگزمز ہو رہے تھے اور صبح اس کا پرچہ تھا مگر وہ سو نہیں پا رہی تھی۔ تقریباً رات کے ایک بجے لاریب نے باہر نکل کر ان کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا کہ میوزک کی آواز کم کریں۔ مگر پڑوسن شاید ڈرنک تھی اور اول فول بکنے لگی۔ تم لوگ ہماری شکایت کرتے ہو۔ "We will kill you" لاریب نے اسے کہا کہ ''اتنے رات گئے میں تمہارے منہ نہیں لگنا چاہتی۔ صبح بات کروں گی بلکہ پولیس کو اطلاع کروں گی کیونکہ تم قتل کی دھمکیاں دے رہی ہو۔''

دوسرے دن لاریب صبح سویرے پولیس کو اطلاع کر کے آفس چلی گئی۔ مگر جیسے ہی شام کو واپس گھر آئی۔ گھر کے دروازے پر لوگوں کا ایک جمِ غفیر تھا۔ اس کا دل بیٹھ سا گیا یا اللہ خیر، یہ کیا ماجرا ہے۔ جلدی سے سڑک پر گاڑی پارک کر کے وہ گھر کی طرف لپکی تو دیکھا کہ پڑوسن اور اس کے بچے اور ان کے چند دوست عزیز سے جھگڑا کر رہے تھے کہ ہم نے پولیس کو اطلاع کیوں کی۔ اب وہ مکمل طور پر لڑائی بلکہ ہاتھا پائی کے موڈ میں لگ رہے تھے۔ لاریب بھاگ کر گھر کے اندر آئی اور پولیس کو فون کر دیا کیونکہ اسے ڈر تھا کہ کہیں یہ سب مل کر ان پر اٹیک نہ کر دیں۔ وہ عزیز سے کہتی کہ گھر کے اندر چلو۔۔۔ ان کے منہ مت لگو۔ مگر عزیز کا غیرت مند۔۔۔ پنجابی خون۔۔۔ تو رگوں کی دیواریں توڑ کے باہر آنے کو بے قرار تھا۔

عزیز سخت غصے میں تھے اور لاریب کی بات سننے کو بالکل تیار نہیں تھے۔ وہ ڈر کر دوبارہ پولیس کو فون کرنے کے لیے گھر کے اندر بھاگی۔ اور جیسے ہی فون کر کے باہر واپس آئی پڑوسوں نے چھوٹی فرنٹ فینس پھلانگ کر اور کچھ نے گیٹ توڑ کر فرنٹ گارڈن میں آ کر عزیز پر حملہ کر دیا۔ بڑی بیٹی باپ کی مدد کو آگے آئی تو اس کے چہرے پر کچھ مار کر اسے بھی زخمی کر دیا۔ سب مل کر عزیز کو زدوکوب کر رہے تھے۔ لاریب ان سب کو چھڑانے کے چکر میں ہلکان ہوئی جا رہی تھی اس کے ہاتھوں اور چہرے پر کئی زخم آ چکے تھے۔ وہ چیخ چیخ کر لوگوں کو مدد کے لیے بلا رہی تھی مگر کوئی بھی آگے نہیں آ رہا تھا۔ سارے انگریز ہمسائے کھڑکیوں میں سے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ انگریز پڑوسن نے پاکی باسٹرڈز، پاکی باسٹرڈز کی رٹ لگائی ہوئی تھی۔ اتنے میں پولیس وین سائرن بجائی نظر آئی شاید کسی محلے دار نے بھی فون کر دیا تھا۔۔۔ ایسا بلوہ دیکھ کر۔۔۔

عزیز کے سر اور ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔ لاریب کے چہرے پر بھی کئی زخم تھے۔ بڑی بیٹی کی آنکھ بھی زخمی ہوئی تھی پولیس کے آتے ہی شہہ پا کر انگریز پڑوسن

نے زور زور سے پھر پا کی، پا کی کہنا شروع کر دیا کہ انہوں نے ہمیں مارا ہے۔

لاریب پولیس کو بتانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ''انہوں نے ہمیں مارا ہے۔ ہم پر ریشلی موٹیوٹڈ اٹیک کیا ہے۔ قصوروار وہ ہیں۔ ہم نہیں، ہم نے تو پولیس کو خود بلایا ہے۔'' مگر پولیس آفیسر لاریب کی بات پر کوئی خاص توجہ نہیں دے رہا تھا بلکہ انگریز پڑوسن کی بات زیادہ توجہ سے سن رہا تھا۔ لاریب نے آفیسر سے کہا کہ ''وہ اسے منع کرے کہ وہ کب سے پا کی پا کی چلا رہی ہے ورنہ وہ آفیسر کی شکایت کرے گی کیونکہ وہ ان کی بے عزتی کر رہی ہے اور Racist ریمارکس دے رہی ہے مگر پولیس کچھ بھی نہیں کر رہی۔''

پولیس آفیسر نے لاریب کی بات سنی ان سنی کر کے انہیں تحکمانہ لہجے میں گھر کے اندر جانے کے لیے کہا کہ وہ ان سے بعد میں بات کرے گا۔ پہلے انگریز عورت کی بات سن لے۔ چند منٹ کے بعد دونوں پولیس آفیسر گھر کے اندر آ گئے۔ اور آئے ہی کہا۔

''Mr. Aziz, you are under arrest for assaulting your neighbour and attacking a police officer.....!''

لاریب اس سفید جھوٹ پر تقریباً چیخ اٹھی ۔۔۔ What ۔۔۔ الفاظ جیسے اس کے حلق میں اٹک سے گئے ۔۔۔ عزیز نے اسے ہاتھ کے اشارے سے کچھ مزید کہنے سے منع کر دیا ۔۔۔ لاریب نے بہت دکھ سے سوچا ۔۔۔ ایک گھٹیا انگریز کے مقابلے میں ۔۔۔ ہمارا اسٹیٹس چاہے کچھ بھی ہو ۔۔۔ ہم چاہے جتنا عرصہ بھی اس ملک میں گزار لیں ۔۔۔ مگر ہم ہمیشہ پا کی ۔۔۔!!

○

بھائی جان

سوہا کو اپنی دوست ثوبیہ کی ہر مرد کو بھائی جان کہنے کی عادت سے سخت چڑ تھی۔ جان نہ پہچان۔ بھائی جان سلام۔۔۔ سوہا اسے گاہے بگاہے ٹوکتی رہتی تھی اور اگر اس کی اس عادت سے زیادہ ہی عاجز آ جاتی تو اسے باقاعدہ ڈانٹ پلا دیتی۔ سوہا کا نقطہ نظر تھا کہ ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کو بھائی جیسے مقدس رشتے سے منتھی کر لینا درست نہیں ہے۔ اور پھر مرد ذات کا کیا بھروسہ۔۔۔! ''آج کل کے زمانے میں تو اپنے سگے بھائی ڈھنگ سے اپنے نہیں بنتے تو تم غیروں کو بھائی اور وہ بھی جان بنانے پر تلی ہوئی ہو۔'' وہ ثوبیہ کو سمجھانے کی کوشش کرتی۔ کالج جاتے ہوئے اکثر دونوں میں اس موضوع پر تکرار ہوتی رہتی تھی۔

ثوبیہ کا موقف تھا کہ جس شخص سے کوئی خونی رشتہ نہ ہو تو پھر اس کو بھائی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے مگر سوہا کے خیال میں یہ لفظ بھائی کی توہین تھی۔ وہ ثوبیہ کو طرح طرح کے دلائل دے کر قائل کرنے کی کوشش کرتی کہ ''بھائی تو اصل معنوں میں وہی ہے جس کے ساتھ ماں کے پیٹ میں پیر پسارے ہوں اور باقی سب۔۔۔ نامحرم!''

آج بھی دونوں کالج جانے کے لیے جیسے ہی بس میں سوار ہوئیں۔ کنڈیکٹر نے ذرا سا اخلاق سے راستہ کیا چھوڑا۔ ثوبیہ رشتوں کی پستک نکال کر بیٹھ گئی۔۔۔ ''بھائی

جان ہمیں ریگل کے اسٹاپ پر اترنا ہے۔ بس میں رش بہت ہے۔ کچھ نظر بھی تو نہیں آرہا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پاؤں منزل سے آگے جانکلیں۔'' اور ساتھ ہی اس نے ایک استفہامیہ نگاہ سوہا پر ڈالی۔ گویا اسے اپنی دانست میں کنڈیکٹر کو بھائی جان کہنے کا جواز بتا رہی ہو۔ مگر سوہا کا موڈ صبح صبح ہی آف ہو چکا تھا۔ ثوبیہ کی بات کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے وہ بس کی چھت کو گھورے جا رہی تھی۔ ٹکٹیں کاٹتے ہوئے کنڈیکٹر کا دونوں اور خاص طور پر سوہا کو کن اکھیوں سے دیکھنا سوہا کو زہر لگ رہا تھا۔

اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ چلتی ہوئی بس میں سے چھلانگ لگا دیتی مگر مجبوری تھی کیونکہ کالج وقت پر پہنچنا بہت ضروری تھی اس لیے کہ پہلے ہی پریڈ میں کیمسٹری کی کھڑوس میڈم کا ٹسٹ تھا۔ لیٹ ہونے پر تو وہ کبھی معاف نہ کرتی کیونکہ ڈسپلن کے معاملے میں وہ بہت سخت تھی۔

میڈم کھڑوس دیر سے آنے والی لڑکیوں کے اس قدر لتے لیتیں کہ خدا کی پناہ میڈم کا بس نہیں چلتا تھا کہ لیب میں موجود سارے کیمیکل اکٹھے کر کے۔ کاک ٹیل بنا کر۔ لیٹ لطیف قسم کی لڑکیوں کو پلا دیتیں کہ مروکم بختو۔ لیٹ آنے کا اتنا شوق ہے تو اب مستقل ہی لیٹ ہی جاؤ۔

سوہا کو اچھی طرح یاد تھا کہ ابا مرحوم زندگی بھر اس بات پر سختی سے کاربند رہے کہ جن مردوں سے عورتوں کا نکاح ہو سکتا ہے وہ سب نامحرم ہیں اور ان کے ناموں کے ساتھ سابقے لاحقے لگا کر انہیں حرمت والے رشتوں کے برابر کرنا۔ ان سے ہنس ہنس کر باتیں کرنا۔ ننگے سر اور کھلے منہ ان کے پاس بیٹھنا۔ شرعی احکامات کی سراسر خلاف ورزی تھی۔ جسے ابا مرحوم نے کبھی قبول نہ کیا۔ اس لیے انہوں نے رشتے کے جتنے کزن

تھے۔ان سب کا گھر میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا تھا کیونکہ ''بھائی جان کے پردے میں کیا کیا گل کھلتے ہیں میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ابا کہتے اور اکثر ''گل'' لفظ پر بہت زور دیتے۔

بی اے کا امتحان ہوتے ہی دونوں سہیلیوں کے لیے اچھے رشتے آ گئے۔سوہا بیاہ کر لندن چلی گئی اور ثوبیہ امریکہ۔شروع شروع میں تو دونوں کا کبھی خطوط تو کبھی ٹیلی فون اور ای میل سے رابطہ رہا مگر رفتہ رفتہ گھریلو ذمہ داریوں میں پڑ کر دونوں اپنی اپنی دنیاؤں میں مگن ہو گئیں مگر جب کبھی ثوبیہ سے بات ہوتی۔سوہا اس کا مذاق اڑاتے ہوئے پوچھتی۔''ارے کتنے اور بھائی جان بنا لیے ہیں یا اب تم سدھر گئی ہو۔'' ثوبیہ ہنستے ہوئے جواب دیتی ''ارے یار وہ تو بس یونہی ذرا بھائی جان کہنے سے چٹخارہ بڑھ جاتا تھا۔اور تم تو ہر بات پر ہی سنجیدہ ہو جاتی تھی۔''

لندن آنے کے بعد سوہا کچھ زیادہ ہی مذہبی ہو گئی تھی۔دوپٹہ تو شروع سے ہی سر پر اوڑھتی تھی۔اب باقاعدہ سکارف یعنی حجاب اوڑھنا شروع کر دیا تھا۔

اب رفتہ رفتہ سوہا نے یہاں کے اسلامک سرکلز میں بھی جانا شروع کر دیا تھا۔ بڑے بڑے دینی اجتماعات ۔۔۔ مگر اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ نوجوان لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کو برادرز اور سسٹرز کہتے نہ تھکتے کچھ عرصے بعد پتہ چلتا کہ برادر اور سسٹر کے درمیان رومانس چل رہا ہے اور کتنوں کی تو دیکھتے ہی دیکھتے شادیاں بھی ہو گئیں۔برادرز، سسٹرز سب ہی ایک دوسرے کا Biodata حاصل کرنے میں چپکے چپکے لگے رہتے۔وہ یہ سب حرکات دیکھتی اور حیران ہوتی رہتی کہ یہ کونسا اسلامک کلچر ہے؟ کہاں تو مرد اور عورت کو نگاہیں نیچی کرنے کا حکم۔عورت کو حکم کہ آواز میں

بے جا لوچ پیدا نہ کرے مبادا مرد کے دل میں کوئی برا خیال راسخ ہو جائے۔ مگر یہ سب کیا ہے؟ جسے دیکھو دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے۔ بہت سی لڑکیاں تو حجاب میں بھی بے حجاب نظر آتیں۔ اتنے چست لباس زیب تن کیئے ہوتے ۔۔۔۔! وہ اکثر سوچتی کہ کیا سر ڈھانپ لینے کا نام ہی حجاب ہے؟ اصل حجاب تو عورت کی نگاہ میں ہوتا ہے۔ اس کی چال ڈھال۔ اس کے نشت و برخاست، اندازِ گفتگو، آواز، یہ سب حجاب کا حصہ ہیں مگر یہاں تو۔۔۔۔!

سوہا نے رفتہ رفتہ ایسے اجتماعات میں بھی جانا کم کر دیا۔ زندگی اپنی پوری رفتار سے سرپٹ بھاگ رہی تھی۔ تینوں بچے آہستہ آہستہ بڑے ہوتے گئے۔ سکول، کالج اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے یونیورسٹیوں میں چلے گئے۔ بڑا بیٹا صائم میڈیکل کی تعلیم مکمل کر کے ہاؤس جاب کر رہا تھا۔ منجھلی بیٹی شزہ اب بیرسٹر بن چکی تھی جبکہ سب سے چھوٹی کسوٰی میڈیکل کے فائنل ائیر میں تھی۔

اس کے میاں جواد رائے بزنس کی دنیا میں ایک بہت جانا پہچانا نام تھے۔۔۔۔ کسی بزنس ٹائیکون سے کم نہ تھے۔ معاشرے میں بڑی عزت تھی۔ سوہا اکثر اپنی پرسکون گھریلو زندگی، وفادار اور محنتی شریک حیات اور فرمانبردار اولاد کے گن گاتی رہتی۔ زیادہ رطب اللسان ہوتی تو اماں ٹوک دیتیں کہ ''اتنی تعریفیں کرنا اچھا نہیں۔ لوگ بھی حسد کرنے لگتے ہیں۔ اور پھر سکھیوں سہیلیوں کے سامنے تو میاں کی بالکل بھی تعریفیں مت کرو۔ مبادا تمہارے ہی گھر کے درپے ہو جائیں۔ اور شوہر کے سامنے تو کبھی بھی سہیلیوں کی تعریفوں کے پل مت باندھو۔ نہ ہی انہیں شوہر سے زیادہ گھلنے ملنے دو، کیا پتہ میاں کو کب۔ ان کی کون سی ادا بھا جائے پھر روتی پھرو گی۔'' جب

بھی پاکستان فون کرتی بس اماں کے پاس ایسا ہی نصیحتوں کا پلندہ تیار ہوتا جسے سنتے سنتے وہ کچھ بور سی ہو گئی تھی۔ ''اچھا اماں اب بس بھی کریں۔ میں کوئی دودھ پیتی بچی تو نہیں ہوں کہ مجھے کوئی ورغلا لے گا۔ جواد بھی ایک ذمہ دار اور وفادار شوہر ہیں'' وہ اماں کو قائل کرنے کی کوشش کرتی۔ اماں چمک کر کہتیں ''ارے مرد تو ہمیشہ ہی دودھ پیتا بچہ رہتا ہے۔ اس کے اندر کا بچہ تو کبھی بڑا نہیں ہوتا۔ ذرا کوئی اچھی صورت دیکھی تو بچے کی طرح ہمک ہمک کر گود میں سر رکھنے کے لیے بے چین۔۔۔'' اور سوہا ہنستے ہنستے فون بند کر دیتی۔

آج جواد کو آفس سے آنے میں بہت دیر ہو گئی تھی۔ سوہا کب سے ڈائننگ ٹیبل پر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ کھانا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ کئی مرتبہ فون کر چکی تھی مگر جواد کا موبائل بند تھا۔ شاید کسی ضروری میٹنگ میں ہوں۔۔۔ مگر اتنی دیر تو کبھی نہیں ہوتی۔ اکثر فون کر دیتے ہیں اگر لیٹ آنا ہو تو۔۔۔ سوہا سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی اتنے میں جواد کی گاڑی ڈرائیو پر آ کر رکی تو وہ بھاگ کر دروازہ کھولنے کے لیے گئی۔

جواد بہت تھکے تھکے قدموں سے ڈرائیو پر گاڑی پارک کر کے نکلے تو سوہا اس کی حالت دیکھ کر مزید پریشان ہو اٹھی۔ خیریت تو ہے جواد۔ اتنی دیر کیوں ہوئی۔۔۔ سب ٹھیک تو ہے ناں۔ کہیں کوئی۔۔۔! اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔ جواد نے جواب دینے کی بجائے سوہا کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کے لیے کہا اور گھر کے اندر آ گیا۔ جواد صوفے پر جیسے ڈھیر سا ہو گیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے سوہا کی طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''میرا بزنس پارٹنر ارسلان آج صبح ٹریفک کے خوفناک حادثے میں شدید زخمی ہو گیا تھا۔ میں سارا دن اسی چکر میں رہا۔ ہسپتال

میں تھا۔ ڈاکٹروں نے جان توڑ کوشش کی مگر جس کا وقت پورا ہو چکا ہو اسے کون بچا سکتا ہے۔" یہ کہہ کر جواد باقاعدہ ہچکیاں لینے گئے اور اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "مجھ سے اس کی بیوی بچوں کی حالت نہیں دیکھی جا رہی تھی۔ اسی لیے جلدی نہ آسکا۔ ان کا اور کوئی عزیز رشتہ دار اس شہر میں نہیں ہے۔ زیادہ تر رشتے دار ملک سے باہر ہیں۔ ہمیں ہی سب انتظامات کرنا ہوں گے۔" یہ کہہ کر جواد پھر آبدیدہ ہو گئے۔

اگلے چند ہفتے پوسٹ مارٹم۔ تدفین، سوئم، چہلم کی نذر ہو گئے۔ ارسلان کی بیوہ تو جیسے پتھر کی ہو گئی تھی سکتے کی حالت میں تھی، بچے الگ بلک رہے تھے۔ ڈاکٹرز اسے رُلانے کی کوشش کر رہے تھے ورنہ اس صدمے کا اس کے ذہن پر مستقل طور پر برا اثر پڑنے کا خدشہ تھا۔

جواد اور ارسلان کافی عرصے سے بزنس پارٹنر تھے۔ دونوں ہی محنتی اور ایماندار تھے اس لیے شراکت داری اچھی طرح چل رہی تھی مگر ان کا زیادہ میل ملاقات باہر ہی ہوتا۔ گھروں میں آنے جانے کا زیادہ چکر نہیں تھا۔ اس لیے وہ ارسلان کی بیوہ سے صرف چند مرتبہ خاص موقعوں پر ہی ملی تھی۔

زندگی رفتہ رفتہ معمول پر آتی جا رہی تھی۔ جواد نے ارسلان کی بیوہ کو بزنس میں ارسلان کی جگہ پارٹنر شپ دے دی تھی اور ہر طرح سے گھر اور بچوں کی ذمہ داریوں میں مدد کر رہا تھا۔ اب ارسلان کی بیوہ کے فون اکثر آنے لگے۔ وہ اب جواد کو بھائی جان کہنے لگی تھی۔ جس سے سوہا کو بڑی وحشت ہوتی۔۔۔ کبھی کبھی تو فون کافی رات گئے آجاتے تو سوہا کو کچھ ناگواری کا احساس ہوتا مگر یہ سوچ کر کہ بیوہ عورت ہے۔۔۔ اکیلی ہے۔۔۔ شاید کچھ کام ہو گا۔ کبھی تو وہ ان کی گفتگو پر دھیان دیتی اور کبھی نہیں۔

شکی طبیعت کی وہ نہیں تھی۔

آہستہ آہستہ فون سرگوشیوں میں بدلنے لگے۔ اسے کوفت تو بہت ہوتی مگر جواد سے کچھ کہتے ہوئے ہچکچائی تھی کہ کہیں برا نہ مان جائے کہ وہ اس پر شک کر رہی تھی۔ کیونکہ ان کی تیس سالہ ازدواجی زندگی پر کبھی شک کا سایہ بھی نہیں پڑا تھا۔

چند ماہ بعد اڑتی اڑتی خبر آئی کہ جواد اور ارسلان کی بیوہ نے نکاح کر لیا ہے۔ سوہا اس خبر پر کسی طرح بھی یقین کرنے کو تیار نہ تھی۔۔۔ ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ اس نے خود کو تسلی دی۔۔۔ وہ جواد کے بارے میں ایسا سوچ کر بھی شرمندہ ہو جاتی کیونکہ وہ اس قدر چاہنے والا شوہر تھا۔

بالآخر جواد سے اس خبر کی تصدیق کرتے ہی بن پڑی تو اس نے بات کنفرم کر دی۔۔۔ سوہا کے بدن سے مانو کسی نے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ جواد نے بزنس، دوستی اور مذہب کے حوالے دے کر سوہا کو قائل کرنا چاہا مگر اس کے دل کا آئینہ چکنا چور ہو چکا تھا۔

اس کے اندر سے آواز آ رہی تھی۔

ٹوٹ کر دل کا شیشہ کبھی پھر سے جڑتا نہیں ہے
توڑ کر عکس سب وہ محبت بھری اک نگاہ ڈھونڈتا ہے

سوہا نے آنسو پونچھتے ہوئے سوچا۔۔۔ آج پھر ایک بھائی۔۔۔ جان کی بہن نے۔۔۔ ایک دوسری عورت کی دنیا اجاڑ ڈالی تھی۔۔۔ زندگی بھر جس لفظ سے وہ وحشت زدہ رہی آج۔۔۔!

○

ریڈیو کی موت

مومنہ کو بچپن سے ہی صدا کاری کا شوق تھا۔ ریڈیو سے تو اسے عشق تھا پاکستان ریڈیو کے علاوہ ریڈیو سیلون بڑے شوق سے سنتی تھی۔

کچھ پیش کاروں کی آوازوں پر تو وہ جنون کی حد تک فریفتہ تھی۔ ان کے کہے ہوئے جملے اکثر نوٹ کر لیا کرتی اور پروگرام ختم ہونے کے بعد ان جیسی آواز میں بولنے کی پریکٹس کرتی۔ آواز کا زیر و بم دکھانے کا کوئی موقعہ بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔ ڈبیٹنگ سوسائٹی، ڈرامہ سوسائٹی اور نہ جانے کن کن سوسائٹیوں میں جا کر وہ آواز کا جادو جگاتی۔ کچھ لکھنے لکھانے کا بھی شوق تھا۔ طبیعت وزن میں تھی۔ ذرا سی مدد سے اچھے خاصے مصرعے سیدھے کر لیا کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ شعر و شاعری میں پختگی آتی گئی تو مشاعروں کے دعوت نامے آنے لگے۔ ایک تو اچھی شاعری۔ اس پر ترنم گویا دو آتشہ ہو جاتا اور ہر محفل لوٹ کر واپس آتی۔

چند ایک نیوز ریڈرز کی تو وہ دیوانی تھی۔ اکثر ان کی آواز ٹیپ کر کے ویسی ہی خبریں پڑھنے کی کوشش کرتی اور کبھی کبھار اخبار میں سے کچھ خبریں خود بنا بنا کر اپنی آواز میں ٹیپ کر لیتی۔ آہستہ آہستہ اسے خبریں پڑھنے میں اعتماد آتا چلا گیا۔ ایک دن تو لطیفہ ہی ہو گیا۔ مومنہ نے اردو خبریں ریکارڈ کر کے بارہ بجے کے قریب ٹیپ

ریکارڈر آن کر دیا تا کہ ذرا چیک کر سکے کہ گھر میں کوئی اس کی آواز پہچان سکتا ہے کہ نہیں! ابھی اسے ٹیپ ریکارڈر آن کیے چند منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ بڑے بھیا گھر کے اندر آتے دکھائی دیئے۔ ''بھیا آج معمول سے جلدی ہی گھر آ گئے عموماً ایک بجے کی خبریں وہ گھر آ کر ہی سنتے ہیں'' اس نے سوچا۔ مگر ٹیپ ریکارڈر بند نہ کیا۔ بھیا نے جیسے ہی خبریں سنیں۔ پریشان سے ہو اٹھے۔ ''ارے ایک بج گیا مجھے تو گھر آتے آتے بہت دیر ہو گئی ہے۔ میٹنگ کے لیے مجھے ابھی نکلنا ہو گا۔'' اماں نے کہا بھی کہ ''ذرا آرام کر لو۔ ابھی تو آئے ہو۔ یہ موئی خبریں بھی ایک منٹ آگے نہ پیچھے عین ایک بجے شروع ہو جاتی ہیں۔'' اماں ریڈیو والوں کو کوسنے دینے لگیں۔

بھیا اور اماں کی سراسیمگی سے مومنہ پورا پورا لطف لے رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ خبریں پڑھنے کے آڈیشن میں کامیاب ہو گئی ہو۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کھی کھی کر کے ہنسنا شروع کر دیا۔ بھیا کو شک سا گزرا تو ایک لمحے کے لیے رک کر غور سے خبریں سننے لگے۔ ''ارے مومنہ کی بچی یہ تو تم ہو۔ بھیا دھاڑے۔ ٹھہر تو ذرا تیری خبر لیتا ہوں۔ اُلو بنا کر تماشہ دیکھ رہی ہو۔'' اس کے ساتھ ہی اماں بھی کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ ''یہ لڑکی تو آفت کی پرکالہ ہے۔'' اماں کو مومنہ کی شرارت پر جیسے ٹوٹ کر پیار آ رہا تھا۔ ''اللہ اسے ہنستا کھیلتا ہی رکھے۔'' ساتھ ہی اماں نے ڈھیروں دعائیں دینا شروع کر دیں۔ یونہی ہنستے کھیلتے شرارتیں کرتے بچپن کب گزرا۔ پتہ ہی نہیں چلا۔ جیسے ہی مومنہ نے بی اے کا امتحان دیا گویا رشتوں کی قطار سی لگ گئی۔ چند ہی مہینوں میں مومنہ اپنے کزن ماجد سے بیاہ کر لندن سدھار

گئی۔۔۔

ساڈا چڑیاں دا چنبہ وے، بابل اساں اڈ جاناں

ساڈی لمبی اڈاری وے بابل کہیڑے دیس جاناں

اماں آنسو چھپاتے چھپاتے اکثر گنگناتی رہتیں تو مومنہ کی آنکھیں بھی بھر آتیں مگر دونوں ہی ایک دوسرے سے نظریں ملانے سے کتراتیں مبادا ضبط کے بندھن ٹوٹ کر سب کچھ بہا کر لے جائیں۔

لندن آ کر سب سے پہلا کام مومنہ نے جو کیا وہ ایشائی ریڈیوز کے بارے میں معلومات تھیں۔ صبح سے ریڈیو لے کر بیٹھ جاتی اور ہر فریکونسی پر بٹن گھما گھما کر ریڈیو لگاتی۔ کبھی لونگ ویو تو کبھی میڈیم۔ کبھی شارٹ ویو تو کبھی ایف ایم۔ بالاخر چند دنوں کی ہی مشقت کے بعد اسے بی بی سی کے علاوہ چند اور کمیونٹی ریڈیوز کے بارے میں پتہ چل گیا۔ ایک ہی ہفتہ کے پروگرام سننے کے بعد اس نے پروگراموں اور پیش کاروں کی استعداد کار کا اندازہ لگا لیا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے سبجیکٹ پر ریسرچ کئے اور یونہی بغیر تیاری کے ریڈیو پر آ کر سامعین کو آوازیں دے دے کر بلاتے کہ بھئی کہاں ہو۔ آواز دو۔ جلدی آؤ ورنہ میری قابلیت کا پول کھل جائے گا۔ کبھی کبھی تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے کہ لاری اڈے پر بسوں کے کنڈیکٹر آوازیں لگا لگا کر مسافروں کو بھرتی کرتے اور دوسری بسوں کے مسافروں کو جلدی جانے کا چکمہ دے کر اپنی بس میں لے آتے۔ چاہے وہاں مسافروں کو گھنٹوں انتظار ہی کرنا پڑتا۔ کیا مجال جو مسافر بس سے اتر جائے۔ ایک دفعہ بس کے اندر گیا تو دونوں جہانوں سے گیا۔۔۔!

بی بی سی کے اردو سروس کے پروگرام اچھے تھے مگر یہ پروگرام تو وہ اکثر پاکستان میں بھی سنتی رہتی تھی۔ لوکل بی بی سی ایشیا نیٹ ورک کے ڈسکشن پروگرامز، البتہ زیادہ جاندار تھے اور حالاتِ حاضرہ کے بارے میں پوری ریسرچ ان کے ہاں موجود ہوتی مگر چند ایک کمیونٹی ریڈیوز تو بس گزارا ہی تھے مگر میوزک اچھی سناتے تھے جس سے مومنہ کا سارا دن مزے سے گزر جاتا۔

ایک ہی مہینے کے اندر مومنہ ریڈیو پر باقاعدگی سے کال کرنے والوں کے ناموں سے بھی واقف ہوگئی تھی چند لوگ گھوم پھر کر ہر ریڈیو پروگرام میں فون کرنا گویا اپنا دینی فریضہ سمجھتے تھے کچھ آوازوں اور اندازِ گفتگو سے تو وہ سخت الرجک تھی آدھی رات کو چند خواتین فون کر کے بیکار گفتگو کرتیں۔ مومنہ اکثر سوچتی کہ ان عورتوں کو آدھی رات کو ریڈیو پر فون کرنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں۔۔۔۔!

چند ایک پیش کاروں کا اردو تلفظ تو اس قدر خراب تھا کہ اس کا دل چاہتا انہیں بے بھاؤ کی سنا ڈالے۔ ایک دو مرتبہ تو اس نے کنٹرول روم میں فون کر کے سرزنش بھی کی کہ ''ڈھنگ کے لوگ پروگرام کے لیے بھرتی کیوں نہیں کرتے کیا فی سبیل اللہ کام کر رہے ہیں کہ جو منہ میں آئے بولتے چلے جائیں۔۔۔!'' بعد میں مومنہ کو پتہ چلا کہ بعض کمیونٹی ریڈیوز پر لوگ واقعی مفت کام کرتے ہیں کیونکہ انتظامیہ کا موقف ہے کہ ''ہم آپ کو شہرت دے رہے ہیں۔۔ اور کیا چاہیے آپ کو۔۔۔!''

جیسے جیسے مومنہ کی یہاں کی ایشائی کمیونٹی سے واقفیت بڑھتی گئی اس پر اور کئی انکشافات ہوتے چلے گئے۔ چند ایک مسلمان پریزینٹرز نے اپنے نام انگریزوں جیسے رکھ چھوڑے تھے۔ جس سے بالکل پتہ نہیں چلتا تھا کہ ان کا مذہبی تشخص کیا ہے۔ مثلاً

کوئی صاحب اے بی سی تو کوئی محترمہ ایکس وائی زیڈ بنی ہوئی تھیں۔

جیسے ہی مسلمانوں کے مذہبی تہوار آتے تو ایک مسلمان پیش کار تو حد ہی کر دیتیں کیا مسلمان، کیا ہندو، کیا سکھ، کیا عیسائی۔ سب کے لیے ایسی ایسی دعائیں اور نالہ شیون کرتیں کہ عرش والوں کو بھی پریشان کر کے رکھ دیتیں۔ وہ اکثر سوچتی ''کہ جس شخص کا اللہ پاک کی وحدانیت کے بارے میں عقیدہ ہی درست نہ ہو۔ اس کے لیے ایک مسلمان کا دعائیں کرنا کہاں تک واجب ہے۔ ان کی تو صرف ہدایت کی دعا ہی کی جاسکتی ہے کہ اللہ ان کا دل ایمان کی روشنی سے منور کر دے۔ مگر یہ سب۔۔۔! اسے درست نہیں لگ رہا تھا!

ادھر ایک غیر مسلم پیش کار کچھ عرصے سے قرآن کا ترجمہ پڑھ پڑھ کر دماغ خراب کر رہا تھا۔ ایسے کلمے اور درود کا ورد کرتا جیسے اللہ کے احد و واحد ہونے کی دل سے گواہی دے رہا ہو۔'' اور اس سے بڑا موحد اور کوئی نہیں ہے۔ مومنہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟ ''ایک شخص جس کا عقیدہ ہی مختلف ہے۔ کیا وہ ہی قرآن پڑھنے اور اس کا مطلب سمجھانے کے لیے رہ گیا ہے۔ یہ تو کھلی منافقت ہے۔ مذہب کا مذاق اڑانے والی بات ہے! اگر مذہب اسلام اتنا ہی اچھا ہے جتنا تم پرچار کر رہے ہو تو پھر مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے؟'' اس سے آگے اس کا ذہن مفلوج ہو جاتا! ہفتے میں ایک مرتبہ غزل (گجل) کا پروگرام ہوتا اور ایسی ایسی شاعری اور تلفظ سننے کو ملتا کہ بندہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لے۔ کبھی کبھار چند ایک کالرز معیاری شاعری پیش کرتے مگر اکثریت تو۔۔۔!

ایک کمیونٹی ریڈیو کو محدود مدت کے لیے لائسنس ملا تو وہ مختلف پروگراموں کے

لیے اسٹاف بھرتی کر رہے تھے۔ مومنہ نے فون کر کے اپوائنٹمنٹ لیا اور آڈیشن کے لیے چلی گئی۔ آواز، ادائیگی اور تلفظ سب برابر تھے۔ سلیکٹ نہ ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ معمولی سے معاوضے پر انہوں نے مومنہ کو ہفتہ وار اردو خبریں اور ایک ڈسکشن پروگرام کے لیے جاب کی آفر کر دی۔ تنخواہ تو بہت کم تھی مگر اپنے شوق کے سامنے مومنہ کو اس کی پرواہ نہ تھی۔

جیسے ہی مومنہ کی آواز آن ایئر ہوئی۔ ہر طرف سے توصیفی جملے سننے کو ملنے لگے۔ رفتہ رفتہ اس کا فین کلب بنتا جا رہا تھا اور اسے اس کام میں لطف آنے لگا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔ اچھی فیڈ بیک اور پریکٹس سے مومنہ کے کام میں نکھار آتا گیا۔

چند ہفتوں کے بعد یہ کمیونٹی ریڈیو بند ہو گیا تو اس سے ایک دوسرے ریڈیو اسٹیشن کی انتظامیہ نے رابطہ کیا کہ ''بیساکھی پر خاص پروگرام کرنے ہیں اگر آپ کچھ وقت نکال سکیں۔'' پروگرام کنٹرولر نے پوچھا۔ مومنہ مزید بات چیت کرنے کے لیے ریڈیو کے بگ باس سے ملنے ریڈیو اسٹیشن چلی گئی۔ ''ہم نے آپ کی آواز سنی ہے۔ بہت اچھی ہے۔ آپ کا فین کلب بھی ہے۔ اب وہ ریڈیو تو بند ہو چکا ہے آپ ہمارے ریڈیو پر کام کریں۔ ادھیڑ عمر اور ویٹ باس نے تمہید باندھی اس۔کے بعد وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا جیسے مومنہ کی طرف سے کسی سوال کا منتظر ہو۔۔۔

مومنہ کو خاموش دیکھ کر اس نے بات آگے بڑھائی کہ ''دراصل یہ بیساکھی کا پروگرام ہے تو یہ پروگرام کرنے کے لیے مناسب یہی ہو گا کہ آپ اپنا نام بدل کر رنجیت کور رکھ لیں۔'' وہ مومنہ کے جذبات سے بے خبر بولے جا رہا تھا۔

ادھیڑ عمر اوورویٹ باس کی بات سن کر مومنہ کا تو جیسے خون ہی کھول اٹھا۔ اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے سختی سے کہا ''الحمد اللہ میں ایک مسلمان ہوں اور اپنے اسلامی تشخص پر فخر کرتی ہوں۔ میں دو ٹکے کے ریڈیو پر اپنی آواز سننے کے لیے اپنی عاقبت خراب نہیں کر سکتی۔''

یہ کہہ کر ادھیڑ عمر باس کو سراسیمہ سا چھوڑ کر وہ بڑے بوجھل قدموں اور دکھی دل سے ریڈیو اسٹیشن کی عمارت سے باہر آ گئی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے آج ''ریڈیو کی موت'' ہو گئی ہو۔۔۔۔!



ٹک ٹک دیدم۔۔۔

''حساس لوگ عمر کی نقدی جلدی ختم کر دیتے ہیں''۔

رابعہ اکثر اس فقرے پر غور کرتی رہتی۔ وہ ایک ممتاز سماجی کارکن تھی اور قدرت نے اسے ایک نہایت حساس اور دردمند دل کی نعمت سے نوازا تھا۔ خدمت خلق کو بس اس نے زندگی کا اوڑنا بچھونا بنالیا تھا۔

پچھلے پچیس برسوں سے وہ ایک NGO نہایت کامیابی سے چلا رہی تھی۔ جس کا نصب العین ہی دکھی دلوں کی خدمت کرنا تھا۔ وہ جب بھی کسی ضرورت مند کی مالی یا اخلاقی مدد کرتی تو اس کی روح طمانیت کے احساس سے سرشار سی ہو جاتی۔ اسے اکثر عربی زبان کی مشہور کہاوت یاد آ جاتی کہ ''زمین کو فیاض لوگوں کے جام سے حصہ ملتا ہے۔'' اس کی شدید خواہش تھی کہ اپنے حصے کا سارے جام ہی تشنہ لبوں سے لگا دے۔ کسی ٹوٹے ہوئے دل کا سہارا بن جائے۔ دکھیوں کی مدد کرتے ہوئے اسے صرف اگر کوئی لالچ تھا تو ڈھیروں دعائیں سمیٹنے کا۔۔۔ جب وہ کسی کی مدد کرتی اور جواب میں اس سے پوچھا جاتا کہ وہ اس کے لیے کیا کر سکتے ہیں تو مسکرا کر کہتی ''بس میرے حق میں دعا کر دیں۔ میری محنت کا اجر اگلے جہان میں خدا خود عطا کرے گا۔''

یوں تو سماجی خدمت کرتے ہوئے رابعہ کو کافی عرصہ گزر گیا تھا مگر اس طویل

عرصے میں اسے چند واقعات آج بھی روزِ اول کی طرح یاد تھے جب اس نے ضرورت مندوں کی مدد کی تھی تشکر کے احساس سے ان کی آنکھیں کیسے بھیگ جاتی تھیں اور ساتھ ہی رابعہ کی آنکھیں بھی نم سی ہو جاتیں۔ برسوں پہلے اس نے ایک ایشیائی خاتون کی مدد کی تھی جو کہ خانگی تشدد کے سبب ایک ریفوج میں رہائش پذیر تھی اور مقررہ وقت کے بعد اسے کمیونٹی میں ہاؤسنگ تلاش کرنا تھی۔ ریفوج والے یوں تو ایسی خواتین کی کافی مدد کرتے مگر جہاں انہیں کچھ زیادہ دقت پیش آتی وہ لوکل کمیونٹی آرگنائزیشن کو ایسے کیسز ریفر کر دیا کرتے تھے۔ شاہ جہاں کا کیس بھی ایسا ہی تھا۔

جب وہ پہلی مرتبہ شاہجہاں کی اسسمنٹ کرنے ریفوج میں گئی تو شاہ جہاں سخت پریشان تھی کہ ریفوج سے نکل کر وہ کہاں جائے گی۔ جوان بچیوں کا ساتھ تھا اور ایسے میں کسی بھی علاقے میں رہائش اختیار کرنے سے ڈرتی تھی مبادا کس قسم کی نسل پرستی کا نشانہ بن جائے۔ ریفوج میں رہنے والی انگریز عورتوں کے رویوں سے وہ پہلے ہی دل برداشتہ تھی جو بات بات پر لڑائی جھگڑا کرنے کا بہانہ تلاش کر لیتیں تھیں۔ بچے الگ مار اماری پر اتر آتے۔ کئی مرتبہ تو ان کے بچوں نے شاہ جہاں کے بچوں کو پاکی کہتے ہوئے ان پر تھوکا بھی۔ مگر وہ خود کو بہت بے بس اور مجبور پاتی تھی۔ ریفوج کے منتظمین اچھے تھے مگر ہر وقت کی چخ چخ اور شکوے شکائتوں سے وہ بھی بیزار سے ہو جاتے تھے۔ اس لیے شاہ جہاں ان سے شکایت کرتے ہوئے ذرا گھبراتی تھی مبادا ریفوج سے ہی نکال دیں۔

شاہ جہاں اور اس کی بہن کی شادی بیس برس قبل ان کے دور پار کے عزیزوں میں دو بھائیوں سے ہوئی تھی۔ کچھ عرصہ تو خیریت سے گزرا۔ پھر شاہ جہاں کے شوہر کو

نشے کی لت پڑ گئی۔ ایسی حالت میں وہ شاہ جہاں کو کافی زدوکوب کرتا۔ بچے سہم کر رہ جاتے۔ بہن اور بہنوئی جو ساتھ والے گھر میں رہتے تھے چیخ وپکار سن کر بیچ بچاؤ کرانے کے لیے آتے تو وہ انہیں بھی بے عزت کردیتا رفتہ رفتہ انہوں نے ان کے معاملے میں دخل اندازی بند کردی۔ ایسے میں شاہ جہاں کو خدا کے سوا کسی کا سہارا نہیں رہا۔ بچے بہت چھوٹے تھے وہ ماں کا کیا سہارا بنتے انہیں تو خود سہارے کی ضرورت تھی۔

ایک دن تو حد ہی ہوگئی۔ شاہ جہاں کا شوہر کسی معمولی سی بات پر اس قدر برہم ہوا کہ اس کے کپڑے پھاڑ ڈالے اور نیم برہنہ حالت میں اسے گھسیٹتا ہوا گھر کے پچھواڑے میں گزرنے والی ریلوے ٹریک پر لے گیا" آج تو تیرا خاتمہ کر کے ہی دم لوں گا، تجھے ریل کی پٹری سے باندھ کر ٹرین سے تیرے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں گا۔ حرامزادی۔۔۔" اس کے منہ میں جو آتا بکتا جا رہا تھا۔ بچے الگ رو رہے تھے، آدھی رات کا وقت تھا۔ کہیں سے بھی مدد ملنے کی امید نہ تھی۔ ایسے میں شاہ جہاں بلک بلک کر رونے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی بے بسی پر قدرت کو رحم آ گیا۔ جیسے ہی دور سے آتی ہوئی کار کی تیز روشنیاں شاہ جہاں کے چہرے پر پڑیں تو اس نے شور مچانا شروع کردیا۔ کار قریب آئی تو پتہ چلا کہ وہ پولیس کی گشتی کار تھی جو آدھی رات کے وقت گھوم پھر کر دیکھ رہے تھے کہ کہیں کوئی امن عامہ کا مسئلہ نہ ہو یا کسی کو مدد کی ضرورت نہ ہو۔

پولیس نے شاہ جہاں کے شوہر کو گرفتار کر کے اس غریب کی جاں بخشی کروائی اور اسے بچوں کے ساتھ ایک ریفوج میں بھیج دیا۔

اپنی کہانی سناتے سناتے شاہ جہاں ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ " میری بہن

اور بہنوئی میرے شوہر کے سلوک سے دل برداشتہ ہو کر انگلینڈ چھوڑ کر اسکاٹ لینڈ چلے گئے تھے اور میرے خیال میں وہ ایڈنبرا میں رہتے ہیں مگر میرا ان سے رابطہ ٹوٹ چکا ہے۔ عرصہ بارہ سال سے میں نے ان سے بات نہیں کی۔ باجی اگر آپ میری بہن کا پتہ لگا دیں تو میں آپ کو زندگی بھر دعائیں دوں گی۔ میں بوڑھے والدین کو ملک میں اپنے حالات بتا کر۔ اس عمر میں پریشان کرنا نہیں چاہتی۔ ہمیشہ انہیں یہی بتایا ہے کہ میں سکھی ہوں۔۔۔۔!''

میں نے شاہ جہاں کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ ''میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گی کہ اس کی بچھڑی ہوئی بہن کو تلاش کرنے میں اس کی مدد کروں۔'' شاہ جہاں سے ضروری کوائف لے کر میں واپس دفتر آ گئی اور مقامی اردو اخبار کے دفتر فون کر کے ایک اشتہار شائع کروا دیا۔ دو ہی دن بعد دفتر میں سکاٹ لینڈ سے ٹیلی فون آ گیا، کہ ''ہم اس فیملی کو جانتے ہیں اور ایک دو روز میں پتہ کر کے آپ کو اطلاع کریں گے۔'' میں نے فون کرنے والے صاحب کا فون نمبر ازراہ احتیاط نوٹ کر لیا مگر شاہ جہاں کو ابھی مطلع کرنا نہیں چاہتی تھی مبادا اس کے بچھڑے ہوئے عزیزوں کا پتہ نہ چلے اور وہ بیچاری ایسے ہی اپنی امیدوں کے چراغ روشن کر کے بیٹھ جائے۔

میں دل ہی دل میں دعا گو تھی کہ شاہ جہاں کی بہن اور بہنوئی کا اتا پتہ مل جائے تو اسے کس قدر خوشی ہو گی۔ کس قدر سلجھی ہوئی عورت ہے۔ بات کرتی ہے تو لگتا ہے منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ اور کس مصیبت کا شکار تھی غریب۔ پھر بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرتی رہی۔ میں اسی ذہنی کشمکش میں مبتلا تھی کہ تیسرے دن اسکاٹ لینڈ سے انہی صاحب کا پھر فون آ گیا کہ انہیں اس فیملی

کا پتہ چل گیا ہے۔اور ساتھ ہی اس نے ان کا فون نمبر مجھے دے دیا۔ جس کے لیے میں نے بے حد شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے بہت سی دعائیں دے ڈالیں۔

میں نے اسکاٹ لینڈ فون کر کے شاہ جہاں کی بہن اور بہنوئی سے بات کی تو اس کی بہن کی آواز رندھی ہوئی تھی۔اس نے بھی ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں۔ میں نے شاہ جہاں کا نمبر اسے دے کر کہا کہ ’’پہلے مجھے شاہ جہاں سے بات کر لینے دو اور اس کے بعد اس سے رابطہ کرنا۔‘‘

جیسے ہی میں نے شاہ جہاں کو فون پر اطلاع دی کہ اس کے بچھڑے ہوئے بہن بہنوئی مل گئے ہیں تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ کہنے لگی کہ ’’باجی مجھے یقین نہیں آ رہا۔‘‘ اس کے ساتھ ہی وہ روتی جا رہی تھی مگر یہ خوشی کے آنسو تھے۔ میں نے اسے بتایا کہ ’’اس کی بہن کچھ ہی دیر میں اسے فون کرے گی وہ تیار رہے‘‘ اور ساتھ ہی میں نے اس کی بہن کا نمبر اسے ازراہ احتیاط دے دیا۔ شکریہ کہتے کہتے اور دعائیں دیتے دیتے شاہ جہاں کی زبان نہ تھک رہی تھی۔ میں نے اسے ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں اور رندھی ہوئی آواز اور پُرنم آنکھوں کے ساتھ فون بند کر دیا۔

’’خوبصورتی امید خوشی اور وقار اس دنیا کو رہنے کے قابل بناتے ہیں‘‘ دیوار پر آویزاں کتبے کو پڑھتے ہوئے میں نے رب العزت کا شکریہ ادا کیا کہ میں کسی دکھیا کے کام آسکی۔ کسی کی زندگی میں امید اور خوشی لا کر اس کے لیے زندگی کی خوبصورتی میں اضافہ کر سکی اور ایک دکھی انسان کو باوقار انداز میں جینے کی نوید سنا سکی۔ وگرنہ تو عزتیں، ذلتیں، بخشنے والی خدا کی ذات ہے!

برسوں پہلے ہونے والا یہ واقعہ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد تھا۔ پتہ نہیں کیوں

اچانک آج یہ واقعہ مجھے یاد آ گیا تو دفتر میں بیٹھنے کا مزید من نہ چاہا۔ میں نے سوچا باہر نکل کر کچھ چھوٹے موٹے کام ہی کر لوں۔ ساتھ میں پوسٹ آفس ہے۔ آج کی ڈاک بھی پوسٹ آفس چھوڑ آؤں گی۔ جیسے میں باہر نکلی تو پوسٹ آفس کے راستے میں مجسٹریٹ کورٹس کے پاس ایک خستہ حال انگریز نوجوان مجھے بڑے غور سے ایک ٹک دیکھتے جا رہا تھا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا کہ شاید وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے مگر پھر میں اسے اپنا وہم سمجھ کر آگے بڑھ گئی۔ نہ جانے مجھے کیوں لگ رہا تھا کہ دو آنکھیں میرا اب بھی تعاقب کر رہی ہیں مگر میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

آج پوسٹ آفس میں معمول سے زیادہ رش تھا اور مجھے قطار میں کھڑے تقریباً آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا۔ اور کوئی دن ہوتا تو شاید میں اتنا انتظار نہ کر سکتی مگر آج ہفتے کا آخری ورکنگ ڈے تھا اور خطوط سپرد ڈاک کرنا بے حد ضروری تھا۔

پوسٹ آفس سے نکل کر میں واپس دفتر آ رہی تھی کہ وہی خستہ حال انگریز نوجوان مجھے پھر نظر آ گیا۔ وہ پھر مجھے غور سے دیکھے جا رہا تھا۔ جیسے ہی میں اس کے پاس سے گزری وہ تھوڑا سا آگے بڑھا۔ جیسے مجھ سے ہمکلام ہونا چاہتا ہو۔ مگر میں اسی رفتار سے چلتی رہی۔ ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا ہو گا کہ جیسے کسی نادیدہ طاقت نے میرے پاؤں آگے بڑھنے سے روک دیئے ہوں۔ میں بادلِ نخواستہ پھر پیچھے پلٹی تو دیکھا کہ وہ انگریز نوجوان ابھی بھی مجھے ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔ میں جیسے ہی اس کی طرف متوجہ ہوئی وہ دو قدم اور آگے آ گیا اور آتے ہی بولا:

"I am very hungry, can I have some money please to buy food."

اوہ۔تو یہ معاملہ ہے۔ میں نے اسے غور سے دیکھا کہ کہیں نشئی یا شرابی تو نہیں ہے۔ جو اکثر راہ چلتوں سے پیسے مانگتے رہتے ہیں۔ایسے لوگوں کو میں سختی سے منع کر دیا کرتی تھی۔ مگر یہ خستہ حال انگریز نوجوان قدرے مختلف نظر آرہا تھا۔"" اگر تم بھوکے ہوتو میرے ساتھ آؤ میں تمہیں کھانا خرید کر دیتی ہوں" میں نے جب اسے کہا تو وہ بغیر کچھ کہے میرے ساتھ چل پڑا۔ میں قریب والے ایرانی ٹیک اوے میں اسے لے گئی اور اس سے کہا کہ وہ جو بھی کھانا چاہتا ہے اس کا آرڈر کر دے وہ احسان کے بوجھ تلے جیسے دبا جا رہا تھا۔اور بولا "Anything will do" اس نے برگر چپس اور ڈرنکس کا آرڈر دے دیا تو میں نے ٹیک اوے والوں کو بل کی ادائیگی کر دی۔اس کی زبان تھینک یو تھینک یو کہتے نہ تھک رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ "کوئی بات نہیں۔بھوکوں کو کھانا کھلانا ثواب کا کام ہے۔" مجھے کہیں بزرگان دین کا یہ قول کہ "مذہب اسلام بھوکے کو کھانا کھلانا اور اچھے اخلاق کا نام ہے" یاد آرہا تھا۔

وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے میرے آگے تقریباً جھک سا گیا۔ میں نے سوچا شاید اسے کچھ پیسوں کی بھی ضرورت ہوگی اس لیے میں نے دس پونڈ کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا کہ وہ رکھ لے۔اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آرہا تھا۔اب کی بار تو اسے ضبط کا یارانہ رہا اور اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈے چلے آرہے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے گلے لگانا چاہتا ہو یا پھر کم از کم میرے ہاتھ پکڑ کر میرا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہو۔مگر شاید ایک مسلمان عورت سے ہاتھ ملانے کی اسے ہمت نہیں ہو پا رہی تھی۔

"Don't worry we are all human beings"

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ تو اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

مسکراتے ہونٹوں اور سرشار روح کے ساتھ میں ٹیک اوے سے باہر آ گئی۔ لیکن آنسوؤں سے لبریز دو آنکھیں دم سادھے اب بھی مجھے ٹک ٹک دیکھے جا رہی تھیں۔ مگر اب وہ تشکر کے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔۔۔!!!



تعارف

اور

تخلیقی سفر

تعارف

خاندانی نام: رضیہ خالدہ سلطانہ

قلمی نام: رضیہ اسماعیل

پیدائش: ۹/جون (۱۵/رمضان المبارک)
بھروکی چیمہ (پاکستان)

برج: جوزا

اولاد: دو بیٹیاں
ثناء عائشہ اسماعیل
ڈاکٹر وردہ اسماعیل

شریکِ سفر: محمد اسماعیل اعظم

پہلی شعری کاوش: ۱۹۷۱ء سنٹرل گورنمنٹ گرلز کالج اسلام آباد
کے انٹر کالجیٹ مشاعرے میں طرحی مصرع پر غزل لکھی
جو بعد میں کالج میگزین میں شائع ہوئی۔
؎ آ گئے پھر میری زنجیر ہلانے والے

پہلی نثری کاوش: ۱۹۷۳ء میں گورنمنٹ گرلز کالج گجرات میں
افسانہ نویسی کے مقابلے میں انعام حاصل کیا

برطانیہ آمد: ۳۱/دسمبر ۱۹۷۳ء

تعلیم وتربیت: بی اے (آنرز) پنجاب یونیورسٹی لاہور
ایم اے انگلش کراچی یونیورسٹی
پبلک ایڈمنسٹریشن ڈپلومہ
آکسفورڈ یونیورسٹی
مانٹیسوری (Montessori) ٹیچنگ ڈپلومہ لندن
سوشل ورک ڈپلومہ برمنگھم
ایم اے سوشل ورک - واروک یونیورسٹی
ڈاکٹریٹ: لندن یونیورسٹی - موضوعِ مقالہ
''خانگی تشدد کے بچوں پر اثرات''
(ہر امتحان امتیازی نمبروں اور اسکالرشپ کے ساتھ پاس کیا)

پیشہ وارانہ خدمات: برٹش سول سروس
بی سی سی آئی بنک
ایوننگ میل نیوز پیپر
ایجوکیشن ویلفئیر سروس
سوشل سروسز
کمیونٹی والنٹری سروس ایڈوائزر

فلاحی اداروں
سے وابستگی: پاکستانی خواتین کی ادبی اور ثقافتی تنظیم ''آ گہی'' کی بانی اور
تاحیات صدر (تنظیم کی بنیاد ۱۹۹۷ء میں رکھی گئی)
ریڈیو ایکس ایل - نیوز ریڈر
ریڈیو شائین - براڈ کاسٹر

ویمن ایڈ (Women Aid)

بلیک ویمن فورم (Black Women Forum)

سمال ہیتھ کمیونٹی فورم

اقبال اکیڈمی

نیشنل اکیڈمی آف برٹش رائٹرز

سردار میموریل ویلفیئر ٹرسٹ

برطانیہ میں بہترین کمیونٹی خدمات پر
ملینیئم کمشن کی تاحیات فیلوشپ

مشاغل اور دل چسپیاں:	کتب بینی، قلم کی ناز برداریاں، مطالعہ فطرت، خودکلامیاں، سیروسیاحت فلم بینی اور خدمتِ خلق
پسندیدہ عالمی شخصیات:	ہیلن کیلر، ذوالفقار علی بھٹو، میلکم ایکس شہزادی ڈایانا، نیلسن منڈیلا، عبدالستار ایدھی اور عمران خان
تخلیقی جہات:	غزل، نظم (پابند، آزاد، نثری)، ماہیے دوہے، افسانہ، کہانی، مختصر ڈراما، کالم رپورتاژ، انشاپردازی، طنز ومزاح اور سفرنامہ

ادبی اور تخلیقی سفر

شاعری

- گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو (غزلیں، نظمیں)......۲۰۰۰ء
- سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں (نظمیں)......۲۰۰۱ء
- میں عورت ہوں (نثری نظمیں + انگریزی ترجمہ)......جون ۲۰۰۰ء
- پیپل کی چھاؤں میں (رنگ رنگ کے ماہیے)......۲۰۰۱ء
- ہوا کے سنگ سنگ (غزلیں، نظمیں، دوہے)......۲۰۱۱ء
- خوشبو، گلاب، کانٹے (پانچوں مجموعوں کی کلیات)......۲۰۱۲ء
- تتلیاں اُداس ہیں......شاعری/مصوری (زیرِ طبع)

نثر

- چاند میں چڑیلیں (طنز و مزاح)......۲۰۰۰ء
- کہانی بول پڑتی ہے (پوپ کہانیاں)......۲۰۱۲ء
- کاغذی ہے پیرہن (افسانے، زیرِ تصنیف)
- ہم روحِ سفر ہیں (ایک منفرد سفرنامہ، زیرِ تحقیق و ترتیب)

تالیفات

- نذرانۂ عقیدت......مجموعۂ درود شریف......۱۹۹۷ء
- نیشنل ویمن ڈائریکٹری ۱۹۹۹ء

(برطانیہ میں قلم کار خواتین کی حوالہ جاتی دستاویز)......بہ اہتمام ''آگہی''

- رائٹ ٹریک (Write Track)......۲۰۰۰ء

(''آگہی'' کے زیرِ اہتمام برطانیہ میں ینگ ایشین ویمن رائٹرز کی نثری اور شعری تخلیقات کا خاص نمبر، اردو اور انگریزی میں)

- پوئٹری ٹائم (Poetry Time)......۲۰۰۰ء

(''آگہی'' کے زیرِ اہتمام برطانیہ میں ینگ ایشین رائٹرز کا شاعری کا مقابلہ اور انعامات حاصل کرنے والی تخلیقات کتابی شکل میں شائع کی گئیں)

- قرضِ وفا (شہناز مزمل کی شاعری کا انتخاب)......۲۰۰۲ء

''آگہی'' ویب سائٹ کا اجراء ۱۹۹۹ء

www.aaghee.co.uk

رابطہ: ای میل

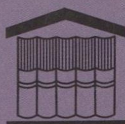
aaghee@hotmail.com





"My main point about the pop story is that writers need to write for readers, which means keeping their fiction entertaining and readable. I like to read and approach literature first from the standpoint of a reader."

Design By:
Muhammad Ahsun GULL



بک ہوم

بک سٹریٹ 46- مزنگ روڈ لاہور' پاکستان فون : 37245072 - 042-37231518 فیکس: 042-37310854

E-mail: bookhome1@hotmail.com - bookhome_1@yahoo.com
www. bookhomepublishers.com